آخری پڑاؤ کا کرب
پرویز اشرفی

آخری پڑاؤ کا کرب

پرویز اشرفی

نام کتاب : آخری پڑاؤ کا کرب
مؤلف : پرویز اشرفی
اشاعت اوّل : ۲۰۱۱
صفحات : ۱۴۴
تعداد : ۴۰۰
قیمت : -/120
ترتیب : یاسر امام
ناشر : پرویز اشرفی
طباعت :
سائز : 18X22/8
کتاب ملنے کے پتے

یہ کتاب اتر پردیش اردو اکاڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی
اس کتاب کے مندرجات سے اتر پردیش اردو اکاڈمی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

انتساب

اپنے والد محترم حاجی عبدالرحمٰن صاحب

و

والدہ محترمہ عزیز النساء مرحومہ

کے نام جن کی

تعلیم و تربیت نے مجھے اس لائق

بنایا

پرویز اشرفی

تعارفی خاکہ

پورا نام	:	پرویز عالم
قلمی نام	:	پرویز اشرفی
تعلیم	:	بی۔ایس سی۔بی۔ایڈ
تاریخ پیدائش	:	۱۰ر ستمبر ۱۹۵۵ء
ادبی آغاز	:	۱۹۷۰ء
معاشی مشغلہ	:	درس وتدریس، وابستگی شعبۂ ادارت ادارہ الحسنات رامپور
علمی مشغلے	:	افسانہ نگاری، مضمون نگاری، اداریہ نویسی
مطبوعات	:	۱۔ اورنگ زیب عالم گیر
	:	۲۔ علاؤالدین خلجی
	:	۳۔ شیر شاہ سوری

فہرست

پیش لفظ

رشید احمد صدیقی مرحوم نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا تھا۔ میری ذاتی رائے ہے کہ افسانہ اردو نثر کی آبرو ہے۔ غزل کی طرح اردو افسانہ بھی ہر دور میں مقبول رہا ہے۔ غزل کی موجودہ صورتِ حال محمد قلی قطب شاہ، حاتم اور آبرو کے دور میں بالکل مختلف تھی زبان و موضوعات کے اعتبار سے اسی طرح افسانہ بھی داستان اور کہانی سے گزرتا ہوا اور اسلوب و ہیت کے تجربوں سے تپ کر کندن بنتا ہوا ایک مقبول صنف کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

میں ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں لیکن لکھنے کا سلسلہ ۱۹۷۰ء سے جاری ہے درمیان میں طویل تعطل پیدا ہوا لیکن معاشی ضرورتوں سے رامپور آنے کے بعد یہاں کی ادبی فضا نے پھر سے سوئے ہوئے قلم کار کو بیدار کر دیا۔ ادارہ الحسنات سے وابستگی اور مرتضٰی ساحلؔ تسلیمی سے قربت نے مجھے لکھنے پر اکسایا۔ چونکہ میں بنیادی نثر نگار تھا افسانہ پڑھنے کے ذوق کے ساتھ ساتھ لکھنے کا ذوق بھی تھا اس لیے اسی صنف میں خصوصی طور پر خامہ فرسائی کی۔ میرے افسانے ملک گیر شہرت کے معتبر رسائل اور اخبارات کے خصوصی ضمیموں میں شائع ہوتے رہے اور غیر محسوس طور پر ان کی اتنی تعداد ہو گئی کہ دو انتخاب بہ آسانی شائع ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا انھی افسانوں کا پہلا انتخاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں شامل افسانوں میں آپ کے احساسات کی ترجمانی ہے یا نہیں اور سماج کو درپیش مسائل کو میں نے محسوس کر کے انھیں موثر ڈھنگ سے افسانے کے قالب میں

ڈھالا ہے یا نہیں؟ ان سوالوں کا جواب تو آپ ہی دے سکتے ہیں مجھے امید ہے کہ آپ اس انتخاب ''آخری پڑاؤ کا کرب'' کو شرفِ قبولیت سے نوازیں گے۔

افسانوں کے انتخاب اور انھیں کتابی صورت میں پیش کرنے کے لیے ہر مرحلے پر میرے عزیز اور محسن مرتضیٰ ساحلؔ تسلیمی اور برادر محمد رضوان خاں نے مجھے بے لوث تعاون سے نوازا ہے اس کے لیے میں ان کا ممنون و متشکر ہوں۔

پرویز اشرفی

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں
(ساحر لدھیانوی)

پرویز اشرفی ایک مختصر تعارف

پرویز اشرفی کا تعلق اردو شعرو ادب کے اس زرخیز علاقہ سہسرام سے جہاں شعری ادب اور افسانوی ادب میں بہت سے ایسے نام سامنے آئے ہیں جن کے گہرے تفکر، مشاہدات اور تجربات کی بدولت معیاری، عصری افسانے وجود میں آئے ہیں اور افسانہ نگار مستند اور معتبر قرار پائے ہیں۔ ڈاکٹر حسین الحق، شفق سہسرامی، سیف سہسرامی، محترمہ ایس۔ کے جبیں، رامیشور سنگھ کشیپ المعروف لوہا سنگھ قابل ذکر ہیں۔ عین تابش، شمیم قاسمی، بدر وفا شیدائی، شاہد جمیل اور ارمغان ساحل پرویز اشرفی کے ہم جماعت قلمکار ہیں۔

پرویز صاحب رامپور منتقل ہونے سے قبل پرویز عالم کے نام سے لکھتے تھے لیکن جب رامپور (یو۔ پی) میں سکونت اختیار کی تو وہ پرویز اشرفی ہو گئے۔ پرویز اشرفی ذی شعور قلمکار ہیں درس و تدریس سے وابستگی، تاریخ کے مطالعہ سے شغف، مذہبی، سیاسی، صحافتی اور سماجی شعور اور معاشی مسائل سے نبرد آزمائی نے ان کے افسانوں کو زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔ ان کے افسانے عموماً سماج کے متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

پرویز اشرفی کے افسانوں کے موضوعات اخلاقی قدروں کا زوال، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت ازدواجی زندگی کے مسائل، فرقہ وارانہ فسادات، مذہب کے حوالے سے اندھی عقیدتیں، اور دہشت گردی وغیرہ ہیں۔ معاشرتی زندگی کے کربناک واقعات کو انھوں نے نہایت سلیقے اور نفسیاتی ڈھنگ سے افسانوں کے قالب میں ڈھالا ہے۔

پرویز اشرفی نے متعدد کہانیاں اخبار کے تراشوں سے بھی اخذ کی ہیں۔ کسی زمانے میں کرشن چندر کو یہ ملکہ حاصل تھا وہ خبروں سے پلاٹ کے تانے بانے بنتے اور نہایت مشاقی سے انتہائی مؤثر عصری افسانہ تحریر کر دیا کرتے تھے۔ اس دور میں بہت سے قلمکاروں نے اس روایت کو اختیار کیا ہوا ہے۔ پرویز اشرفی بھی ایسی کہانیاں لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ فسادات، دہشت گردی، رشوت خوری اور دوسری سماجی و اخلاقی برائیوں پر انھوں نے اخبار سے استفادہ کیا ہے۔ افسانہ ''آتنک وادی'' اور صندل کی فطرت مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ ماہنامہ الحسنات رامپور (یو۔ پی) میں بے شمار اداریے تحریر کیے ہیں جو تا حال جاری ہیں۔ بہر حال پرویز اشرفی ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے مختلف موضوعات پر اچھے افسانے اردو ادب کو دیے ہیں۔

مرتضیٰ ساحل تسلیمی
محلہ: شتر خانہ
رامپور۔ 244901 (یو۔ پی)

آخری پڑاؤ کا کرب

ندیم صاحب کو اپنے بیٹے پر بہت فخر تھا۔ ہر باپ کی طرح انہیں لگتا تھا کہ بڑھاپے میں یہی بیٹا تو ان کا سہارا بنے گا۔ ندیم صاحب نے اپنی کم آمدنی میں بھی اس کی بڑے پیار سے پرورش کی تھی خود خواہشوں کا گلا گھونٹ کر اپنے بیٹے کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کو پورا کیا تھا ندیم صاحب ایک پرائیوٹ اسکول میں ٹیچر تھے شاید ان کی بدنصیبی تھی معاشرے میں ایسے آدمی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی جس کے کام پر لفظ 'سرکاری' کی مہر نہ ہو حالانکہ وہ ایک سچے ایماندار سیدھے سادے اور محنتی انسان تھے اسی بنا پر ان کی بیوی بھی کنارہ کش ہو چکی تھیں رشتے قایم تھے لیکن دونوں کے درمیان سرکاری اور بیکاری کی لکیر کھینچ گی تھی ان حالات کے باوجود ندیم صاحب کا خواب تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو روشن مستقبل دیں وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کے ساتھ ساتھ ایک اُردو ماہنامہ میں شعبہ ادارت سے بھی منسلک ہو گئے اب اپنا پورا وقت اسی کام میں صرف کرنے لگے وہ دن بھر چرخی کی طرح گھومتے رہتے سانس لینے کی فرصت نہیں تھی ایک ہی دھن تھی کام کام اور صرف کام وقت نے انہیں محنت کا پھل بھی عطا کر دی اعلی تعلیم حاصل کر کے اپنے پیروں پر کھڑا تھا اس مقام تک پہنچانے میں ندیم صاحب کی زندگی کا اہم حصہ گزر گیا تھا عمران کو اعلی تعلیم کی بدولت اونچا عہدہ بھی مل گیا اسی عہدے کی بنیاد پر اونچے گھرانوں سے رشتے آنے لگے آخر کار وہ دن بھی آیا جب ندیم صاحب بیٹے کے سر پر سہرا بھی دیکھ لیا چاندسی بہو گھر آ گئی کچھ ہی دن بعد بیٹے کا تبادلہ بڑے شہر میں ہو گیا اور اپنی بیوی کو لے کر چلا گیا اور ندیم صاحب ایک بار پھر تنہا رہ گئے جیسے

بیٹے کی پیدائش سے پہلے رہتے تھے مگر اس وقت ساتھ تھا جوانی کے جوش کا اور آنے والی زندگی کے حسین رنگین خواب کا آج وہ سب پیچھے چھوٹ گیا تھا رہ گی تھیں تو عمر سے دھندلائی بے نور آنکھیں اور صلاحیت سے زیادہ محنت کر کے شل ہو چکا کمزور جسم بیٹے کے نوکری پر باہر جاتے ہی جیسے ان کی دنیا ویران ہوگئی تھی عمران نے جب ان کی خواہش کو جانے بغیر اپنی پسند کی لڑکی ڈھونڈ لی تو ندیم صاحب نے بغیر کسی روکاوٹ کے بڑی دھوم سے شادی کردی تھی جب بہو کو لے کر نوکری پر جانے لگا تو ندیم صاحب کی صرف یہی خواہش تھی کہ وقفہ وقفہ سے ہونے والی چھٹیوں میں وہ ان کے پاس آتے رہیں گے اب انہیں انتظار رہتا اس گھڑی کا جب ان کا لاڈلا بیٹا عمران بہو کو لے کر ان کے پاس آئے گا ندیم صاحب بیٹے اور بہو کے لیے طرح طرح کی چیزیں لا کر رکھتے تاکہ انہیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہو بیٹھک اور کمرے کی صفائی خود کھڑے ہو کر کراتے بیٹے بہو کا گھر آنا ان کے لیے خوش کن لمحہ ہوتا جب تک قیام کرتے اس دوران اپنا اکیلا پن اپنی ڈھلتی عمر کی مایوسی بالکل بھول جاتے۔ صرف اپنی لہلہاتی اس فصل کی شادابی میں ہی ڈوبے رہتے اسی درمیان کبھی کبھی اپنی اہلیہ کی بہت کمی محسوس ہوتی لیکن دل میں اٹھتے اس درد کو محسوس کرنے والا تو بے نیاز تھا بہت کوشش کے باوجود بھی نسیمہ کی اکھڑ فطرت میں تبدیلی نہ آسکی وہ اپنی دولت کے گھمنڈ میں چور مائکے کی دہلیز پر دن گزارنے میں فخر محسوس کرتی وقت نے بیٹے کو بھی باپ بنا دیا یہ خبر سن کر ندیم صاحب اپنے پوتے کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئے ان کے آنے کے دن ایک ایک کر کے انگلیوں پر گنتے اپنے بچے اور پوتے کی باتیں کرتے ہوئے انتظار کی گھڑیاں گزارتے کیسا ہو گا میرا پوتا؟ کتنا بڑا اور کس کے جیسا؟ وہ بار بار اللہ کا شکر ادا کرتے جس نے یہ دن دکھایا لیکن کیا یہ دن انہیں آسانی سے دیکھنا نصیب ہوا ہے؟ ایک طویل جدو جہد اور نہ ختم ہونے والے انتظار کے بعد وہ عمران ان کو اس مقام تک لا سکے۔ اس لمبے سفر کو طے کرنے میں انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا اگر یہ حساب لگائیں تو محسوس ہو گا کہ اس وقت تو انہوں نے صرف پایا ہے کھویا کچھ بھی نہیں طویل انتظار کے بعد بہو اور بیٹے ان کے چاند سے پوتے کو لے کر آئے تھے گھر میں کیا رونق اور چہل پہل تھی ندیم صاحب نے سب کچھ بھلا کر پوچھا بیٹے اپنی ماں سے پوتے کو ملا دیا؟

جی پاپا وہیں سے ہو کر آرہا ہوں کیسی ہیں تمہاری ماں؟ کیا مجھے یاد بھی کیا؟ پاپا آپ تو ان کی فطرت جانتے ہیں۔ میرے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ اپنے دائرے سے باہر آنے کو تیار نہیں اب آپ ہی بتایئے میں کیا کروں؟ جواب سن کر ندیم صاحب خاموش ہو گئے اس درد کو بھول کر وہ اپنے پوتے کے ساتھ کھیلنے لگے ڈھیروں کھلونے فواد کے آگے رکھ دیے خود گھوڑا بن کر اپنی پیٹھ پر پوتے کو بٹھالیا۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنا سب کچھ لٹا دینے پر آمادہ تھے جب تک وہ لوگ رہے ندیم صاحب اپنی زندگی کے درد کو بھول ہی گئے تھے۔ ان کا موقع بے موقع سینے میں اٹھنے والا درد جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اس بار عمران نے جاتے جاتے یہ اشارہ کر دیا کہ اب وہ اتنی جلدی جلدی نہیں آسکتا کیونکہ فواد کو یہاں وہ سہولت نہیں مل سکتی جو اسے سرکاری کوٹھی میں ملتی ہے وہاں نوکر چاکر آیا سبھی ہیں ایسے میں یہاں اس چھوٹے سے گھر میں آکر کیوں گزارا جائے؟

ندیم صاحب عمران کا منھ دیکھتے رہ گئے۔

''پاپا آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے صرف آپ سے ملنے اور یہاں آکر کچھ دن قیام کرنے کے لیے ہمیں کتنا پریشان ہونا پڑتا ہے اور وہ بیچاری آپ کی یہ بہو کیا یہ ایسی ٹوٹی پھٹی بسوں میں سفر کرنے کی عادی ہے؟ یہاں اس چھوٹے سے شہر میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہر بار اس چھوٹے بچے کو لے کر آنا۔ نہیں پاپا نہیں یہ ممکن نہیں۔ بار بار کی چھٹیاں اور سفر کی پریشانی الگ آخر ہمیں اپنا اس بچے کا مستقبل بھی تو دیکھنا ہے۔'' عمران بولتا جا رہا تھا اور ندیم صاحب کے کان تو جیسے سن ہو گئے تھے بیٹا شاید اپنے مستقبل کی بات کر رہا تھا۔ اسی بیٹے کے مستقبل کے لیے تو اس باپ نے زمانے کے لعن طعن سنے۔ اپنا چین سکون اپنے جسم کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس وقت خود کے بارے میں سوچنے کی بات ہی دماغ میں کہاں آئی تھی باپ کی شفقت بھری بھیگی آنکھوں کو صرف بیٹے کا مستقبل ہی نظر آیا تھا نہ بالوں میں بے وقت آئی سفیدی دکھائی پڑی نہ خود کا روز بروز کمزور ہوتا جسم۔ آنکھوں پر چڑھے چشمے کے نمبر بڑھتے گئے اور کھوکھلے ہو چکے جسم کی کام کرنے کی صلاحیت دم توڑنے لگی پھر ندیم صاحب نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو بہتر سے بہترین مستقبل دیا۔ وہی بیٹا آج کس مستقبل کی بات کر رہا ہے؟ کیا اپنے باپ کی تاریکی میں ڈوبتا مستقبل بیٹا نہیں دیکھ رہا ہے۔

محدود وسائل میں وقت گزار رہے زندگی کے آخری پڑاؤ پر پہنچ چکے وہ بیٹے سے صرف اس کا ساتھ ہی تو مانگ رہے ہیں ان کی کوٹھی ایئر کنڈیشن کار یا ان کے عیش و آرام کا حصہ تو نہیں مانگ رہے ہیں لیکن کیا اس چھوٹی سی چاہت کا ایک قطرہ بھی بیٹے کے پاس دینے کو نہیں ہے؟ چلو! نہ سہی آج تک جس بے لوث شفقت سے بیٹے کے ساتھ رہنے کا لمحہ انہوں نے گزارا ہے اسی بے غرض شفقت سے وہ اس کے آنے کا انتظار بھی کریں گے۔ مہینوں برسوں یا شاید تا زندگی۔

☆☆☆

آستھا

ٹرین پوری رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ سلیپر کلاس مسافر کے اپنی مصروفیات میں لگے تھے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا تھا، کوئی سگریٹ کے کش لگا رہا تھا حالانکہ اب یہ قانونی جرم ہے لیکن یہاں قانون شاید بنتے ہی ہیں توڑنے کے لیے۔ کوئی اپنے زندگی کے تجربے بیان کر رہا تھا تو کوئی اپنے بزنس کے اتار چڑھاؤ پر تبصرہ میں مصروف تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سفر کے دوران ہر چیز کھانے کے عادی ہوتے ہیں خاص کر مونگ پھلی، کیلے وغیرہ۔ ایسے لوگوں نے زبان کا ذائقہ بدلنے کے ساتھ خالی پیٹ کی تکمیل کر لی اور ٹرین کے اس ڈبے کو بالکل کوڑا دان بنا دیا تھا۔ رفتار کے سبب تیز ہواؤں کا جھونکا بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے سامنے بیٹھے ایک مسافر وضع قطع میں تعلیم یافتہ اور جہاں دیدہ معلوم ہو رہے تھے، کافی دیر سے مذہب، تہذیب و سنسکرتی، سیاست، اصول پسندی اور اخلاقیات پر اپنے دوسرے ہم سفر کے ساتھ محوِ گفتگو تھے بہت دیر سے میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ میری نگاہ گو کہ اخبار کے صفحات پر تھی لیکن کان ان کی گفتگو کی طرف لگے تھے۔ ملک میں موجود غریبی پر وہ اس وقت بول رہے تھے۔ خصوصاً نوجوان طبقہ ان کا ہدف تھا۔ اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ اپنے سامنے بیٹھے ایک نوجوان سے مخاطب تھے۔ ''ملک کی غریبی میں اگر سرکار ذمہ دار ہے تو عوام کم ذمہ دار نہیں۔ ہمارے نوجوان کام کرنا ہی نہیں چاہتے اور راتوں رات کروڑپتی بننے کا خوبصورت خواب دیکھتے ہیں۔ کسی گلی، محلے، بازار یا ٹرین میں گزرتے آپ کو بچے، عورتیں اور نوجوان طرح طرح کے حلیے بنائے، قصے کہانیاں گڑھ کر عام آدمی کی نفسیات کو بھنا کر روپے کمانے میں مصروف ہیں۔ ایسے لوگوں نے اس کو ہنر بنا لیا ہے۔ جب انھیں کام

کرنے کو کہو، محنت کرنے کی بات کروتو وہ بڑی ڈھٹائی سے جواب دیتے ہیں یعنی وہ محنت قطعی نہیں کرنا چاہتے۔''

ٹرین اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ وہ صاحب ایسی گفتگو کر رہے تھے کہ آس پاس بیٹھے مسافر بھی ان کی باتوں سے متاثر ہو کر اور نزدیک آگئے۔ بعض نے تو ان کی ہاں میں ہاں ملائی لیکن کیلا کھا کر اس کے چھلکے انھوں نے دوسرے مسافروں کے پیروں کے نزدیک ڈال دیے تھے۔ دوسرے بھائی صاحب نے مونگ پھلیاں تو اپنے منھ میں ڈال لیں اور چھلکے وہیں گرا دیے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اصول اخلاقیات نظم وضبط اور صفائی کی باتیں کر رہے تھے۔ ابھی یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ ایک مسافر نے لنچ کر کے کیلے کے چھلکے کے ڈھیر پر ہی اپنا ہاتھ دھولیا۔ آس پاس کا کیبن بالکل گندہ ہو چکا تھا۔ سفر لمبا تھا بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اپنے برتھ پر نیم دراز ہو کر ایک بار پھر مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ ٹرین کی رفتار نے یہ احساس دلایا کہ ڈرائیور نوجوان ہے ورنہ اکثر ایسی رفتار کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں، اسی درمیان سرگوشیاں میرے کانوں سے ٹکرائیں۔

''دیکھ گھورا تو اس ڈبے میں جا اور سکھیا کو بھی اپنے ساتھ رکھ۔''

''کلوا تو......؟ تو کہاں......؟'' سکھیا اور گھورا نے سوال کیا۔

''میں اس ڈبے کی ساری ذمہ داری سنبھالتا ہوں۔ کلوا نے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ یہ باتیں سن کر میرے کان کھڑے ہوئے، میں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ سامنے تین کم سن بچے تھے جو بوسیدہ حالت کے میلے کچیلے کپڑے بدن پر لپیٹے تھے۔ ان کی صورت وحلیہ دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ کئی روز سے ان لوگوں نے غسل نہیں کیا۔ ہاف گندے نیکر میں بالکل گندی شرٹ اندر کی جانب ڈال رکھی تھی۔ شرٹ کے پچھلے حصے میں بسلیری (بیزل واٹر) کی خالی بوتلوں کو اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے ایئر بیگ میں سامان رکھا ہو۔ سکھیا اور گھورا کلوا کے حکم کے مطابق دوسرے ڈبے میں چلے گئے۔ کلوا نے اپنی آستین سے چہرے کو صاف کیا اور جھاڑو لے کر ڈبے کے فرش کی صفائی کرنے لگا۔ دروازے سے شروع ہو کر ایک ایک کیبن کو اچھی طرح صاف کرتے ہوئے وہ میرے برتھ تک چلا آیا۔ ڈبے میں بیٹھے مسافر اپنی باتوں میں محو تھے۔ کوئی سورہا تھا، کسی کی تیز نگاہیں کلوا پر ٹکی تھیں۔ ایک مسافر نے مزید آگے تک صفائی کرنے کی فرمائش کردی۔

کلوا اپنا کام کر رہا تھا اور میں اس معصوم کلوا کو دیکھ رہا تھا جو اپنے ننھے اور نازک ہاتھوں سے لوگوں کے ذریعہ پھیلائی گئی گندگی کو صاف کر رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کیا یہی ہمارے بھارت کا مستقبل ہیں......؟ ان ہاتھوں میں قلم کے بجائے ریلوے لائن پر پھینکی ہوئی خالی بوتلوں کا بوجھ۔ یہ دن ان معصوموں کے کھیلنے اور پڑھنے کے ہیں لیکن نہ جانے کس کی غلطی نے ان کی یہ حالت بنادی۔ بہر حال ایک بات سے میں خوش تھا کہ یہ بچے محنتی ہیں اور غلط راستے پر نہیں۔ ایسے ہی سیکڑوں سوالات ذہن میں آرہے تھے۔ اسی درمیان کلوا نے میرے برتھ کا نچلا حصہ سلیقے سے صاف کیا اور بڑی حفاظت سے چپلن کو رکھ دیا۔ اب وہ میرے سامنے والی برتھ کی طرف رخ کر چکا تھا۔ جہاں مسافروں نے کیلے اور مونگ پھلی کے چھلکے اور نہ جانے الم غلم کیا کیا چیزیں پھینک رکھی تھیں۔ کلوا اپنی جھاڑو سے ان ساری گندگیوں کو سمیٹتا جا رہا تھا، اتنے میں ایک مسافر نے بڑی حقارت سے کہا:

''ارے چھوکرے! دیکھ صفائی کے بہانے چپل و جوتے غائب نہ کر دینا۔''

''نہیں بابو جی! آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں۔ میں تو آپ کے پاس پھیلی گندگی صاف کر رہا ہوں۔''

''بڑا زبان لڑاتا ہے بے تو۔'' دوسرے مسافر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ کلوا اس کا منہ تکنے لگا۔

''میرا منھ کیا تک رہا ہے چل اپنا کام کر۔'' وہ مسافر تحکمانہ انداز میں چیخا۔ کلوا خاموشی سے اپنا کام کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے مسافر تاش کے پتوں میں گم سفر طے کر رہے تھے، اتنے میں کلوا دوبارہ حاضر ہو گیا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں جھاڑو نہیں تھی بلکہ اس کے خالی ہاتھ ہر مسافر کے سامنے باری باری پھیل رہے تھے۔ جہاں تک میری نظر گئی بہتر برتھ کے سلیپر کلاس میں صرف چند لوگوں نے ایک ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا وہ بھی بڑی قباحت سے۔ بعض نے تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کھلے پیسے نہیں ہیں۔ جب وہ میرے سامنے والی کیبن کے پاس آیا تو اس نے ان مسافروں کے آگے اپنا دستِ سوال خاموشی سے پھیلا دیا جو تاش کے پتوں میں اس قدر الجھے ہوئے تھے کہ کلوا کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہوا۔ کلوا نے آواز دی......

''بابو جی......!'' تب ایک مسافر نے سر اٹھایا۔ ''ارے تو پھر آ گیا......؟ چل آگے بڑھ ابھی۔''

''بابو جی اتنی محنت کی ہے۔ پورے ڈبے کی صفائی کر دی۔ دیکھو صاف ستھرا ہو گیا۔

آپ کے نزدیک تو سب سے زیادہ کوڑا تھا۔ جسے آپ چھونا اور دیکھنا گوارہ نہیں کرتے اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے سمیٹ کر صاف کر دیا... بابو جی۔''

''میں نے تو تجھے صاف کرنے کو نہیں کہا تھا۔ پھر تو نے کیوں صفائی کی......؟ یہ کام تو ریلوے ملازمین کا ہے۔'' اس سوال پر کلوا خاموش رہا۔ وہ معصوم ان سوالوں کی باریکیوں کو کیا جانے کہ ایسے لوگ محنت کی مزدوری نہ دینے کے کتنے بہانے پل بھر میں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ مایوس ہو کر آگے بڑھنے کو تھا، تبھی ان مسافروں میں سے ایک نے اسے روک کر پوچھا ''اچھا اپنا نام بتا تیرا نام کیا ہے۔؟''

''کلوا......کلوا میرا نام ہے۔''

''یہ کیا نام ہوا؟ آخر تیرا دھرم تو کچھ ہوگا، ہندو ہے مسلمان ہے۔'' وہ مزید سوال کرتا کہ کلوا نے کہا ''میں کلوا ہوں اس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''تیرے ماں باپ نہیں جو تو یہ کام کرتا ہے؟'' ایک تیسرے مسافر نے پوچھا۔ ماں باپ کا نام سنتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ دو موٹے آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک گئے بائیں ہاتھ کی آستین سے اس نے آنسو خشک کیے اور بولا۔ ''احمد آباد کے دنگوں میں بھگوان میں آستھا رکھنے والے بھگتوں نے میرے ماں باپ کو زندہ جلا دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ جلتے رہے، لوگوں سے مدد مانگتے رہے لیکن وہاں موجود بھگوان کے بھگت جلتے انسانوں کی چیخ و پکار پر قہقہے لگاتے رہے۔ ماں آگ میں جھلس گئی، باپ نے بدن میں لگی آگ بجھانے کی کوشش میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ میں رو رہا تھا اور بھگوان کے بھگت ہنس رہے تھے۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے آپ لوگ میری مجبوری کا مذاق اڑا رہے ہیں۔''

''بڑا منھ زور ہے رے تو دیکھنے میں چھوٹا ہے اور باتیں اتنی بڑی بڑی۔''

''بابو جی میں کوئی بھیک نہیں مانگ رہا ہوں میں تو محنت کی مزدوری مانگ رہا ہوں۔''

''چل......چل......آگے بڑھ بہت ہو گیا وقت برباد نہ کر ہمیں کھیلنے دے۔''

مذہب، سیاست، اخلاقیات و تہذیب کی بڑی بڑی باتیں کرنے والے مسافروں نے اس معصوم کو ڈانٹ دیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ میں نے اس معصوم کو آواز دی۔ وہ میری طرف مڑا لیکن نزدیک آنے سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے شفقت سے اسے بلایا اور اسے پانچ روپے دیے۔ اس

کے چہرے پر مسکراہٹ کھلنے لگی۔ اس کی زبان سے صرف اتنا نکلا ''بابو جی۔'' اس آواز میں جو درد پنہاں تھا وہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کہا ''یہ روپے میں تمہیں نہیں تمھارے اس جذبے کو دے رہا ہوں جسے ہم محنت کہتے ہیں۔'' اس کی پیٹھ تھپتھپائی وہ مجھے مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ گاڑی جیسے ہی اسٹیشن پر رکی وہ اتر گیا۔ میں کھڑکی سے اسے دیکھتا رہا وہ پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ میری آنکھ کھل چکی تھی۔ ٹرین کی رفتار بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ ٹرین کاشی شہر کے کنارے گنگا ندی پر بنے پل سے گزرنے لگی۔ میرے سامنے بیٹھے ان سبھی مسافروں میں اچانک حرکت ہوئی۔ سب اٹھ کر بیٹھ گئے۔ کسی نے ندی کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا، کسی نے ہاتھ کو پیشانی اور سینے سے چھو کر اپنی عقیدت ظاہر کی۔ کوئی آنکھیں بند کیے دل ہی دل میں کچھ پڑھتا رہا۔ ایک مسافر نے جیب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر ندی میں پھینکنا چاہا۔ میں نے اسے روک کر کہا:

''اس سکے کو اگر آپ ندی میں پھینک دیں تو آپ کا یا اس بہتی ندی کا کیا بھلا ہو گا۔؟''

''یہ تو اپنے عقیدے کی بات ہے، پھر یہ سکہ میرا ہے، اسے ندی میں پھینکوں یا سمندر میں اس سے آپ کو کیا مطلب۔ آپ کا کیا نقصان ہو رہا ہے......؟''

''میرا تو کچھ نقصان نہیں لیکن اس سے بھارت راشٹر کا نقصان ضرور ہوتا ہے۔''

''وہ کس طرح......؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''یہ سکہ جو آپ ندی میں ڈال رہے ہیں یہ بھارت راشٹر کی دولت ہے۔ اسے سمندر یا ندی میں پھینک دینے سے یہ چلن سے باہر ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچیے اگر آپ جیسے اور لوگ بھی اپنے سکے اسی طرح ندیوں اور سمندروں میں پھینک دیں تو ملک میں سکّوں کی قلت ہو جائے گی۔ سکوں کی بربادی سے ملک کے عوام کو دشواریوں کا سامنا نہیں ہو گا؟''

وہ میرا منھ تکتا رہا اور کچھ دیر بعد سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ کی بات تو معقول ہے لیکن اب آپ ہی بتائیں میں اس سکّے کا کیا کروں۔ میں تو اسے اپنی طرف سے ندی میں پھینک چکا ہوں۔ یہ میری آستھا کا سوال ہے۔ اب اسے واپس رکھ نہیں سکتا، اس سے مجھے پاپ لگے گا'' وہ کچھ خوف اور شرمندگی سے بول رہا تھا۔

''اگرایسی بات ہے تو آپ اسے کسی ضرورت مند کو دے دیں، آپ کے اس عمل سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی اور آپ کو بھی پونیہ (اجر) مل جائے گا۔''

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے مجھ سے پوچھا'' کسے دوں، کون ہے ضرورت مند؟''

''کیا یہ سکّہ آپ اس ضرورت مند کلوا کونہیں دے سکتے تھے۔ جس کے کم زور ہاتھوں نے پورے ڈبّے کی صفائی پوری محنت سے کی لیکن آپ سبھی لوگوں نے اس کی مجبوری پر قہقہہ لگایا۔ کتنی دیر تک محنت کرنے کے باوجود بھکاری کی طرح آپ کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا رہا مگر آپ کو تو یہ سکّہ ندی میں پھینکنا تھا، محنت کش کو کیوں دیتے؟'' وہ چپ چاپ منھ جھکائے میری باتوں کو سنتا رہا۔

ٹرین مغل سرائے اسٹیشن پر رک چکی تھی۔ مسافر کچھ اتر رہے تھے اور کچھ سوار ہو رہے تھے کہ ایک جانب سے کوڑا سمیٹتا ہوا کلوا پھر نمودار ہوا۔ جب وہ ان مسافروں تک پہنچا تو آگے بڑھ گیا۔ کلوا نے ان سے پیسے نہیں مانگے لیکن شاید میری بات اس شخص کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے واپس جاتے کلوا کو پکڑا اور اس کے ہاتھ میں دس روپے رکھ دیے۔'' بیٹے! یہ رکھ لو میں تمھارا گنہ گار ہوں۔ میں ان بھائی صاحب کا بھی آبھاری ہوں جنھوں نے آستھا کے وشے (موضوع) پر ایک نئی سیکھ دی ہے۔''

اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے پیار سے کلوا کے گال کو تھپتھپایا اور آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کلوا اگلے ڈبّے میں صفائی کے لیے جا چکا تھا، میں بھی اپنے برتھ پر نیم دراز تازہ اخبار پڑھنے لگا۔ ٹرین مغل سرائے اسٹیشن چھوڑ رہی تھی، رات کی تاریکی کو پوری طرح سورج کی شعاعوں نے نگل لیا۔!!

☆☆☆

آخری فیصلہ

''تو تم نے کیا فیصلہ کیا...؟اس کے ابو نے سوال دہرایا۔
''ابو مجھے سوچنے کا وقت دیجیے۔.'' شازیہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔
''بیٹی! میں تمھارا باپ ہوں۔اب میں تمھیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔مرد کی صورت میں اب کوئی نہیں، تم کیسے رہوگی، تم ہی غور کرو۔''اس کے والد نے سمجھانے کی کوشش کی۔
لیکن وہ خاموش بت کی طرح سنتی رہی۔اور درو دیوار کو حسرت سے دیکھتی رہی۔ ڈرائنگ روم جو کبھی خوبصورت لگتا تھا۔جہاں شاہد اور اس کے قہقہے گونجتے تھے۔سب کچھ ویسا ہی تھا۔صرف شاہد نہیں تھے۔ وہ حسرت ویاس سے کمرے کی ہر ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔اس کی نظر ٹیبل پر رکھی شاہد کی تصویر سے جا ٹکرائی۔شاہد ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔شازیہ نے آگے بڑھ کر تصویر کو اٹھا کر بغور دیکھا جیسے کہہ رہا ہو''مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی...؟'' شازیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے شاہد کی تصویر کو سینے سے لگالیا۔کچھ دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ حقیقت میں شاہد نے اسے بازوؤں میں سمولیا ہے۔اس کا ذہن گردش کرنے لگا۔گزرے دنوں کی یادیں ایک ایک کر کے ذہن کے دروازے پر دستک دینے لگیں۔وہ ماضی کی رنگین وادیوں میں دور تک نکل گئی۔
اس کا ایک گھر تھا۔خوشحالی اس کے قدم چوم رہی تھی۔ پیار کرنے والا شوہر اللہ نے عطا کیا تھا وہ ہر وقت اپنے رب کا شکر ادا کرتی۔وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔گھر میں اللہ کی رحمت سے برکت تھی۔ صنعتی انقلاب نے جہاں صعوبتوں سے نجات دی تو مہنگائی نے عورتوں کو بھی عملی میدان میں اترنے پر مجبور کر دیا۔اب شوہر کے علاوہ وہ بھی ملازمت کرنے لگی تا کہ بڑھتے ہوئے

اخراجات پر نہ صرف قابو پایا جا سکے بلکہ تمام بنیادی ضرورتیں بہ آسانی فراہم ہوسکیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے محنت کی بدولت اللہ نے خوشحالی بھی عطا کردی۔ زندگی کا کارواں خوشیوں کو دامن میں سمیٹتے گزرتا جارہا تھا۔

کل تک وہ جن عزیزوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی، آج وہ اس کے نام کی مالا جپتے۔

''اجی روزی...! معلوم ہے شاذیہ ماشاء اللہ خوشحال ہوگئی ہے۔''

''اللہ سب کو ایسی تقدیر دے۔'' چھوٹی پھوپھی چہک کر کہتیں۔

ادھر بڑی پھوپھی شاذیہ کی بلائیں لیتیں۔ کیسی پیاری گڑیا ہے میری۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ عزیز واقربا حسرت اور حسد کی نظر سے اسے دیکھتے۔

چھوٹی پھوپھی کے لڑکے کی شادی کی تقریب ختم ہوچکی تھی۔ شاذیہ نے دل کھول کر روپے خرچ کیے اپنی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی کی بدولت وہ ہر ایک کے دل میں جگہ پا چکی تھی۔ شاذیہ نے سب کی خدمت کی، دعائیں اس کے دامن میں پھول بن کر گرتی رہیں۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ایک دیندار لڑکی تھی۔ تمام کام کے ساتھ نماز کی سخت پابند تھی۔

شادی کی تقریب ختم ہوچکی تھی۔ تمام مہمان اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ شاذیہ اور اس کے شوہر بھی واپس آگئے۔ زندگی اپنے معمول پر رواں تھی کہ ایک رات عجیب حادثہ ہوا۔ ہاں وہ حادثہ ہی تھا۔ رات کافی ہوچکی تھی۔ صفدر ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ شاذیہ پریشان ہو رہی تھی۔ کبھی باہر کبھی گھر کے اندر۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ شاذیہ دروازے پر بیٹھی انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسی درمیان پتہ نہیں کب صفدر پہنچ گیا اور چیخنے چلانے لگا۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہے....؟''

شاذیہ کی آنکھ کھل گئی۔ ابھی وہ کچھ سمجھ بھی نہیں پائی تھی کہ ایک زوردار تھپڑ صفدر نے اس کے گال پر رسید کردیا۔ وہ درد سے تلملا گئی۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں...؟ ہوش میں تو ہیں؟''

''ہاں... ہاں میں پورے ہوش میں ہوں...'' صفدر زور سے چیخا۔

بے ہوش تو ہو رہی ہے، آج کل میں تیری بدلی ہوئی حرکت دیکھ رہا ہوں، مجھے معلوم ہے آج کل تو اپنے آفس سے دیر سے کیوں آتی ہے؟ چار پیسے تیرے ہاتھ میں کیا ہوگئے میری وقعت ختم ہوگئی۔''

صفدر نشے کی حالت میں چیختا رہا۔ ہنگامہ سن کر آس پڑوس کے لوگ بھی جاگ گئے۔ کچھ لوگوں نے سمجھا بجھا کر دونوں کو گھر کے اندر کیا۔ لیکن وہ رات شاذیہ کے لیے قیامت کی رات ثابت ہوئی۔

صفدر کے ذہن میں شک کے جراثیم نے اپنا گھر بنا لیا تھا۔ مسلسل بے روزگاری سے تنگ آکر وہ چڑچڑا ہوگیا تھا۔ گھر کی ذمہ داری ایسے وقت میں شاذیہ ہی اٹھا رہی تھی۔ ادھر صفدر کی سنگت چند اوباش قسم کے لوگوں کے ساتھ ہوگئی اور انھیں کے ساتھ اس نے شراب نوشی کی عادت ڈال لی۔ شاذیہ کو اس عادت سے سخت نفرت تھی۔ اس نے کئی بار منع کیا خدا اور رسول کا واسطہ دیا لیکن جتنا وہ روکتی صفدر اس کی ایک نہ سنتا۔ اور آج وہ ضرورت سے زیادہ نشہ میں تھا۔ اس نے شاذیہ کی خوب پٹائی کی اور آخر کار مرد کے پاس عورت کے لیے جو آخری حربہ ہے لگاتار تین بار اس کا استعمال کر گیا...... شاذیہ کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن یہ بھی ہوگا۔

غصہ عقل کو کھا جاتا ہے۔ صفدر کو جب احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی ہے تو رجوع کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ بات پرانی ہوگئی۔ شاذیہ اب بے پتوار کی ناؤ تھی۔ وہ آفس میں کام کرتی رہی۔

ایک جوان عورت کب تک تنہا رہ سکتی ہے زندگی کے لمبے راستے پر کسی نہ کسی مرد کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔ اس کے رشتہ داروں نے بار بار دوسری شادی کے لیے زور ڈالا مگر شاذیہ تیار نہ ہوئی، اسے مرد ذات سے ہی نفرت ہو چکی تھی۔

یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ:

......اس کی زندگی میں ایک اور موڑ آیا۔ جب اس کے در دل پر شاہد نے دستک دی...

شاہد ملک کے ایک اہم روزنامہ میں ایڈورٹائزنگ منیجر تھا۔ اکثر بس میں آتے جاتے دونوں کی ملاقاتیں ہوتیں اسی دوران شاذیہ نے زندگی کی کتاب اس کے سامنے کھول دی۔

شاہد کو اس کے حالات سن کر بہت افسوس ہوا۔

''شاذی! اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں....'' شاہد نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''اگر بات قابلِ قبول ہوئی تو برا ماننے کی کوئی وجہ نہیں'' شاذیہ نے بھی مثبت جواب دیا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہوں یا نہ کہوں۔'' شاہد کچھ جھجکتے ہوئے۔ بولا۔

''آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ذرا میں بھی تو سنوں؟'' شاذیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ شاہد نے تین ماہ میں پہلی بار شاذیہ کو مسکراتے دیکھا تھا۔ اور ہمت جٹا کر کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ پھر وہ رک گیا۔ ''دیکھیے شاہد صاحب آپ مرد ہیں۔ جو بات آپ کہنا چاہتے، بے جھجک کہہ دیں۔ یقین کریں اگر نا قابلِ قبول بھی ہوئی تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ برا نہ مانوں گی۔'' شاذیہ نے ہمت بندھائی۔

''شاذی.... شاذی.... ہم لوگ دو الگ راستوں کے مسافر ہیں لیکن منزل ہم دونوں کی ایک ہی ہے کیوں نہ زندگی کے راستے کے بھی مسافر بن جائیں اور ایک دوسرے کو شریک سفر نہیں شریک حیات بنا لیں۔'' شاذیہ کو ایسا لگا جیسے بجلی سی کوند گئی اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ شاہد اچانک اس طرح پرو پوز کریں گے۔ وہ خاموش رہی۔ شاہد کو صرف ایک ٹک دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ وہ سر جھکائے تیز تیز قدم بڑھاتی شاہد کی نظر سے اوجھل ہو گئی۔ شاہد بھی رات بھر سو نہ سکے۔ بار بار خیال ستاتا رہا کہ کہیں اس کی بات شاذیہ کو بری تو نہیں لگی۔

ادھر شاذیہ بہت پریشان تھی۔ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ شاہد کے الفاظ پر غور کرتی۔ صحیح تو ہے آخر کب تک میں تنہا زندگی گزاروں گی؟ کوئی تو سہارا ہونا چاہیے۔ ویسے بھی آج کے معاشرے میں میری جیسی عورتوں کے لیے لوگوں کی ہمدردی کم ہوتی ہے اور حریص نظریں زیادہ پیچھا کرتی ہیں۔ مگر شاہد صاحب میں تو ایسی کوئی بات نہیں محسوس کی۔ کتنی شرافت سے وہ دل کی بات کہہ گئے۔ میں کیا کروں.... اللہ! اب تو ہی میری مدد کرنے والا ہے۔ وہ دعائیہ لہجے میں بڑ بڑانے لگی... یہی کہتے کہتے کب اسے نیند آ گئی خبر نہ ہوئی۔

شاہد مسلسل تین روز سے تراہے پر شاذیہ کا منتظر رہتا لیکن شاذیہ نہیں آئی۔ آج چوتھا دن تھا کافی دیر کے بعد وہ مایوس ہو کر لوٹنے ہی والا تھا کہ دور سے آتی ہوئی شاذیہ پر نظر پڑی۔ گلابی ساڑی میں ملبوس شاذیہ آج بلا کی خوبصورت لگ رہی تھی۔ نزدیک آنے پر شاذیہ نے تین روز تک نہ آنے کی معافی چاہی۔

دونوں آج ڈیوٹی جانے کے بجائے گرین پارک میں چلے گئے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شاہد نے سکوت توڑا۔ شاذی ''کیا فیصلہ کیا....''

''کس بات کا....؟'' شاذیہ نے پوچھا۔
''وہی کیا تمھیں میرا پروپوزل منظور ہے؟''
شاذیہ کی آنکھیں شاہد کو تکنے لگیں اور پھر دھیرے دھیرے پلکیں جھکتی چلی گئیں۔
''ہوں'' ایک ہلکی سی آواز شاذیہ کی ابھری اور ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ شاہد کو لگا کہ ہزاروں جلترنگ ایک ساتھ بج اٹھے ہوں۔

اس طرح وہ شاہد کی شریک حیات بن کر اس کی زندگی میں آ گئی۔ شاہد کی ویران زندگی بہاروں کی آماجگاہ بن چکی تھی۔ اپنی نئی زندگی سے شاذیہ بہت خوش تھی۔ شاہد بھی اسے بہت پیار کرتے... ہر لمحہ اس کی یہی خواہش ہوتی کہ شاذیہ کو کوئی تکلیف نہ ہو، اس کا دل مجروح نہ ہو۔ زندگی کا سفر پیار کے گلیاروں سے ہوکر گزر رہا تھا لیکن ایک کمی اب بھی کھٹک رہی تھی، شاہد و شاذیہ کے چمن میں کوئی پھول اب تک نہیں کھلا تھا۔ شاہد کو اس کا احساس تو نہیں تھا لیکن شاذیہ عورت تھی۔ اب وہ تنہائی کا احساس کر کے پریشان ہوتی۔

ایک دن شاذیہ اپنے دفتر گئی ہوئی تھی۔ شاہد چھٹی میں تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی... شاہد نے سمجھا کہ شاذیہ کا فون ہے ضرور کہیں جانا ہے، اس لیے مجھے بلانے کے لیے فون کیا ہے۔ وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھا... لیکن تب تک فون کٹ گیا... دوبارہ پھر گھنٹی بجی... شاہد نے فوراً ریسیور اٹھایا اور بول پڑا.... ''ہیلو۔ جان من... کیا ارادہ ہے....''

لیکن اچانک اس کے چہرے پر پسینہ کی بوندیں چمکنے لگیں۔ اور کانپتے ہاتھوں سے اس نے ریسیور رکھ دیا۔

شام کو جب شاذیہ پہنچی تو شاہد خاموش اور سنجیدہ تھے۔
''کیا بات ہے، آپ خاموش کیوں ہیں۔؟''
''کوئی بات نہیں ... بس، یونہی....! پتہ نہیں کیوں دل گھبرا رہا ہے'' شاہد نے بات کاٹنے کی کوشش کی۔
''دل گھبرا رہا ہے...؟'' شاذیہ پریشان ہوگئی۔ اگر کوئی تکلیف ہے تو چلیے ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔'' اس نے زور دیا۔
''نہیں کوئی بات نہیں'' تم پریشان نہ ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''نہیں شاہد آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں، بتایئے نا، کیا ہوا ہے۔؟''

''آخر آپ اتنے خاموش سے کیوں ہیں...؟ میرا جی گھبرانے لگا ہے۔'' شاذیہ نے شاہد کے شانے پر سر رکھ دیا۔

شاذیہ شاہد کے سینے سے لگی سسک رہی تھی اور شاہد کی آنکھیں خلا میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

''شاذی...!'' آج دوپہر میں ایک فون آیا تھا۔

''فون...؟؟'' وہ چونکی ''کس کا...؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''پتہ نہیں'' شاہد سنجیدہ ہو گئے۔

''کیا کہہ رہا تھا...؟''

''یہی کہ.... خیر چھوڑو.... کاروباری لوگ ہیں ایسے طریقے اپناتے ہیں۔ کہتے کہتے شاہد کے ماتھے پر پسینہ کی بوندیں ایک بار پھر ابھر آئیں۔

''آپ بالکل پریشان نہ ہوں، کسی نے شرارت کی ہوگی۔''

''ممکن ہے یہی بات ہو۔ آج کل ایک فیشن ہو گیا ہے بلینک کال کر کے لوگوں کو پریشان کرنا'' شاذیہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

رات کے کھانے کے بعد دونوں بستر پر آ گئے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اسی درمیان شاذیہ کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گئی۔ شاہد اندر ہی اندر پریشان تھا۔ اسے کوئی انجانا خوف بار بار چونکا دیتا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بستر سے اٹھا اور اپنے اسٹڈی ٹیبل کے پاس آیا۔ لیمپ روشن کر کے اپنے پیڈ پر کچھ لکھنے لگا۔ کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ سے شاذیہ کی آنکھ کھل گئی ''کیا کر رہے ہیں شاہد؟''

رات کافی ہو چکی ہے اب سو جایئے۔'' اس نے التجا کی۔

''ہاں...آیا.... شاہد نے لیمپ آف کر دیا اور بستر پر آ رہا۔ بہت دیر تک طرح طرح کے خیالوں میں غوطہ زن رہا نہ جانے کب نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

چڑیوں کی چہچہاہٹ نے شاذیہ کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ اٹھی۔ فجر کی نماز ادا کی۔ اس وقت تک شاہد گہری نیند سو رہے تھے۔ تمام فکر سے دور پر سکون چہرہ دیکھ کر شاذیہ کے دل میں ایک

مخصوص جذبہ ابھرنے لگا۔ وہ پیار بھری نظروں سے شاہد کو دیکھتی رہی اور اپنے احساس کی گرمی اس کی پیشانی پر چھوڑ کر باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ باہر آئی اور تمام ہدایات ٹیپ ریکارڈ پر ریکارڈ کر کے دفتر چلی گئی۔

آج دفتر میں شاذیہ کا دل نہیں لگ رہا تھا بار بار کسی انہونی کا احساس خوف زدہ کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے شاذی، تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟'' سلونی نے دریافت کیا۔

''ہاں سلونی! پتہ نہیں کچھ عجیب سا محسوس کر رہی ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے جسم کا ایک حصہ نہیں ہے، اور میں اپاہج ہوگئی ہوں۔''

''ارے یار...! کام کی تھکان سے ایسا ہوتا ہے، آؤ لنچ کرتے ہیں'' سلونی نے تسلی دی۔

''نہیں... سلونی اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا...''

ابھی دونوں سہیلیاں باتیں کر رہی تھیں کہ ٹرن... ٹرن... ٹرن فون کی گھنٹی بجی...

شاذیہ نے ریسیور کان سے لگایا ''ہیلو...۔''

''محترمہ شاذیہ ہیں...؟ دوسری طرف سے آواز آئی۔

''جی۔! میں شاذیہ بول رہی ہوں کہیے کیا بات ہے۔ آپ کون صاحب ہیں...؟''

''دیکھیے آپ جلد سے جلد اپنے گھر آجایئے۔ آپ کے شوہر شاہد صاحب...۔''

''ہاں ہاں... کیا ہوا شاہد صاحب کو...؟'' شاذیہ نے روتے ہوئے پوچھا...

''ان کا کسی نے سوتے میں قتل کر دیا ہے...'' اور فون کٹ گیا۔

شاذیہ پر بجلی سی گر گئی۔ دفتر کے کلیگس نے اسے گھر تک پہنچایا۔ خون میں لپت شاہد کی لاش دیکھ کر وہ بے جان مجسمہ بن کر رہ گئی۔ صرف آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آج اس کا پتوار ٹوٹ چکا تھا۔ سماج کے لوگوں نے حق دنیاداری نبھائی اور زندگی کے مشغلے میں الجھ گئے۔ شاذیہ اب تنہا رہ گئی... اسے یہ مکان کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ جہاں کبھی شاہد اور اس کے قہقہے گونجتے تھے وہاں اب پر ہول سناٹا تھا۔

شاذیہ کے دل میں سوال اٹھ رہا تھا کہ شاہد نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا پھر ان کا دشمن

کون ہوسکتا ہے۔۔۔؟

''بیٹی۔! اللہ کی مرضی کے آگے کس کا بس ہے میری بات مان لو۔'' والد کی آواز نے اس کے خیالوں کا تسلسل توڑ دیا۔ شاہد کی تصویر کو اب وہ بے اختیار چومنے لگی۔ اسی لمحہ فریم کی پشت پر کاغذ کا ٹکڑا دبا ہوا محسوس ہوا، پلٹ کر دیکھا۔ یہ شاہد کی تحریر تھی جو شاید اس رات لکھی تھی اور جلد بازی میں فریم کے پیچھے دبا دیا تا کہ شاذیہ پریشان نہ ہو۔

شاذیہ نے جلدی جلدی تحریر پڑھنا شروع کی۔

ڈیر شاذی...!

نیند آنکھوں سے دور ہے۔ کیا کروں، اس لیے سوچا تمھیں سے بات کروں، تحریر کے ذریعہ۔ تم نے مجھ سے دن میں پوچھا تھا کہ فون کس کا ہے۔ وہ فون کئی بار آیا لیکن ہر بار بغیر بات کیے ہی کٹ گیا۔ آخری بار جب میں نے ریسیور اٹھایا تو یہ دھمکی دی گئی ''میری بات نہ مانی تو انجام اچھا نہ ہوگا'' آواز کچھ جانی پہچانی تھی۔ دراصل آفس کے چند بدعنوان لوگوں نے مجھے خریدنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اپنے ضمیر کا سودا کرنے سے انکار کر دیا۔ تم پریشان ہوتیں یہی سوچ کر تمہیں کچھ نہیں بتایا۔

زندگی کا بھروسہ کیا ہے ممکن ہے جو سانس ابھی چل رہی ہے کل نہ چلے۔ مجھے انجانا سا خوف ستا رہا ہے۔ نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ آج کی یہ رات میری آخری ہے۔ اللہ نگہبان ہے۔

تمھارا۔۔۔۔۔۔۔۔۔شاہد

خط پڑھتے پڑھتے شاذیہ کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ آنکھوں میں شبنمی قطرے ابھر آئے۔

فریم میں لگی تصویر کو سینے سے لگا کر سسکنے لگی۔ ''میرے شاہد۔۔۔۔تم دنیا کی نظروں میں مر چکے ہو مگر تم اب بھی میرے آس پاس موجود ہو۔ میرے دل میں موجود ہو۔ میرے لیے تم اب بھی زندہ ہو۔ میں تمھاری اس سلطنت کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی، کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہی اب میری دنیا ہے'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنے ابو سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''بیٹی! تم نے صحیح فیصلہ کیا، اب میں تمہیں یہاں سے نہیں لے جاؤں گا لیکن ایک باپ کی شفقت کا سایہ بھی ضروری ہے اگر تم بہتر سمجھو۔۔۔۔''

والد کی آنکھوں میں التجا تھی۔ شاذیہ کو جیسے قرار آ گیا۔ شام ہو چلی تھی دور مسجد کی میناروں سے اذان کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ شاذیہ نے جائے نماز بچھائی اور اپنے رب کے آگے سر بجود ہونے چل دی!!

☆☆☆

انتظار

عرس کے موقع پر شہر میں انسانوں کا سیلاب امنڈ آیا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی ، کھوکھے، پنڈال، کھانے کے ہوٹل، چائے اور پان کی چھوٹی دکانیں۔ اسی شور و ہنگامے کے درمیان فقیروں اور مسکینوں کی صدائیں بھی گونج رہی تھیں۔ عقیدت مندوں کا ہجوم زیارت کی تمنا لیے ایک خاص مقام کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کہیں بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مذہبی قائد، سیاسی بازی گر، امیر، غریب، بھکاری، قلاش، مرد و عورتوں کی ریل پیل تھی۔ شور و غل اتنا کہ خود اپنی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔

پہاڑی پر چڑھنے کے درمیان میری نظر ایک بوڑھی عورت پر پڑی جو ایک ٹیلے پر کھڑی بھیڑ میں گزرنے والوں کے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھتی اور زور زور سے آواز لگانے لگتی۔ جب وہ تھک جاتی تو چپ چاپ بیٹھ جاتی پھر چند ہی لمحوں بعد وہی عمل دہرانے لگتی۔ قلعہ گھوم کر جب میں واپس لوٹا تو اس وقت بھی اس ضعیفہ کو پکارتے دیکھا۔ پکارتے پکارتے وہ رونے لگتی تھی۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا بھیڑ کو چیرتا ہوا اس ضعیفہ کے پاس پہنچا۔ میں نے اسے ''اماں'' کہہ کر مخاطب کیا۔ یہ سن کر وہ بے تحاشہ اپنی کمزوری کی پرواہ کیے بغیر میری طرف لپکی اور گرتے گرتے بچی لیکن میں نے اس کو سنبھال لیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لے کر غور سے دیکھا شاید اسے کم نظر آتا تھا۔

''بیٹا!...... میں نے پہچانا نہیں...... کون ہے تو؟''

اس نے ممتا کی جس شدت سے میرا چہرہ تھام رکھا تھا اس سے ایسا محسوس ہوا کہ میری امّی زندہ ہیں۔

''اماں...... مجھے اپنا ہی بیٹا سمجھو...... کیا کوئی کھو گیا ہے......؟''

''ہاں بیٹا...... کل صبح میرا بیٹا اور بہو مجھے یہاں بٹھا کر زیارت کو گئے تھے انھوں نے مجھے یہیں رکنے کو کہا تھا کہ ''اماں تم یہیں بیٹھو بھیڑ زیادہ ہے تمھیں دشواری ہوگی ہم لوگ زیارت کر کے آتے ہیں پھر ساتھ کمرے پر چلیں گے۔''

''لیکن...... بیٹا! آج دوسرا دن ہوگیا وہ لوگ اب تک نہیں آئے۔''

''اماں! آپ گھبرائیں نہیں وہ لوگ مل جائیں گے کہتے ہیں اس در سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔'' میں نے تسلی دی۔ اپنی بوتل سے پانی پلایا۔ نزدیک کے ہوٹل سے کھانا لا کر دیا اپنی موجودگی میں ہی کھانا کھلا دیا۔ سردی زیادہ تھی اس لیے میں نے اپنی گرم شال اسے اوڑھا دی۔ وہ بلک کر رو پڑی۔

''کیا نام ہے تمھارے بیٹے کا......؟'' میں نے پوچھا۔

''عظیم احمد......'' اتنا کہنے کے بعد وہ بولی ''میں جانتی ہوں بیٹا وہ اب نہیں ملیں گے پھر بھی ماں ہوں نا...... اپنی ممتا سے ہار جاتی ہوں۔ دل نہیں مانتا اور نگاہ ڈھونڈنے لگتی ہے۔ دل کو جھٹلا کر یہ جو ممتا ہے وہ پکارنے لگتی ہے۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بتایا۔ اور کچھ وقفہ کے بعد پھر گویا ہوئی۔ ''بیٹا! وہ لوگ مجھے چھوڑ کر چلے گئے میرا عظیم پہلے ایسا نہیں تھا۔ لیکن آج وہ مجھے چھوڑ کر چلا ہی گیا۔ بڑی خواہش تھی کہ زیارت کو جاؤں گی اور میرا عظیم مجھے لے کر جائے گا۔ یہاں آنے سے قبل میری بہو نے سوئی ہوئی حالت میں میرے انگوٹھے کا نشان اسٹامپ کاغذ پر لگا دیا میری آنکھ کھلی تو وہ تیزی سے کمرے سے بھاگ گئی۔''

یہ واقعہ سن کر میں افسردہ ہوگیا۔ ''اماں! انھوں نے ایسا کر کے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ تم انہیں معاف کر دو۔'' وہ کافی دیر تک خاموش کھڑی آنسو بہاتی رہی پھر اپنے آنچل سے آنسوؤں کو خشک کرتے یکایک مجھے اپنے گلے لگا لیا۔ وہ اپنا شفیق آنچل میرے سر پر رکھ کر بولی ''بیٹا...... ! پیار کا بیج فوراً پھل دیتا ہے۔ تم نے اس انجان بوڑھی ماں کو پیار دیا تو میرے سینے میں ممتا کے پھول کھل گئے۔ اس دکھیاری کا سارا درد ایک لمحہ میں سکھ میں بدل گیا اللہ تمھیں ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔''

میں نے بوڑھی اماں کو وہیں کے ایک مقامی اولڈ ایج ہوم میں پہنچا دیا۔ کچھ کپڑے اور

ضروری سامان ضعیفہ کو مہیا کر دیئے۔ اولڈ ایج ہوم کے ذمہ دار کو معقول رقم ادا کر کے گزارش بھی کردی کہ ''اماں'' کا پورا خیال رکھیں گے۔ میں الوداعیہ نگاہ ڈال کر دو ہی قدم چلا تھا کہ اس نے مجھے ''بیٹا...... '' کہہ کر پکارا اور پاس آ کر بولی ...... ''تم نے مجھے ماں کہا ہے نا......؟ بیٹا تمھارے اس بول نے مجھے بڑا سکون بخشا ہے ماں کے پاس سے خالی ہاتھ جانے کا غم نہ کرنا۔'' ابھی میں کچھ سمجھ پاتا کہ اس نے اپنے آنچل کو پھاڑ کر میرے سر پر رکھ دیا اور کہا...... ''بس بیٹا! یہی پونجی ہے میرے پاس۔ ایک ماں زندگی کے تمام دکھ سکھ اسی میں سمیٹتی رہتی ہے۔ اس ماں کی دعا ہمیشہ تمھارے ساتھ ہے، جاؤ تمھیں اللہ کے حوالے کیا۔''

وقت پر لگا کر اڑ گیا۔

دو سال بعد پھر میں نے ماں سے ملنے کا قصد کیا اس کے لیے بہت سارا سامان خریدا۔ سردی کے مدنظر کچھ گرم کپڑے بھی خرید لیے اور روانہ ہو گیا۔

صبح ہی صبح میں اولڈ ایج ہوم کی جانب چل پڑا۔ لیکن وہاں تو سارا منظر ہی بدلا ہوا تھا نہ اولڈ ایج ہوم تھا نہ وہ راستے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آس پاس کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ سب عمارت غیر قانونی تھی اس لیے حکومت نے اسے منہدم کر دیا۔ میرا ذہن چکرانے لگا۔ اب اماں کو کہاں ڈھونڈوں......؟ اماں کو ڈھونڈنے کی تگ و دو میں نہ جانے کتنے بے سہارا لوگوں سے ملتا اور ان کی داستانیں سن کر بوجھل قدموں سے ہوٹل واپس آ جاتا۔ کسی نے مجھے ایک آشرم کا پتہ دیا اور صبح جلد پہنچنے کی ہدایت دی کیوں کہ زیادہ تر وہاں ٹھہرے لوگ بھیک مانگنے یا مزدوری کرنے نکل جاتے ہیں۔ صبح صبح آشرم پہنچ کر لوگوں سے اماں کے بارے میں دریافت کیا لیکن اماں نہیں ملی۔ اب میں مایوس ہو چکا تھا۔ واپسی کے خیال سے میرے قدم ہوٹل کی جانب اٹھ گئے ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''بابو جی! آپ کی ماں مل گئی؟'' ایک بھکارن مجھ سے پوچھ رہی تھی دو دن قبل ماں کی تلاش کے دوران وہ ملی تھی۔ میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میرا جواب سن کر خاموش ہو گئی اور اپنے بچے کے پاس ہی بیٹھ گئی جسے اس نے میلے کچیلے کپڑے میں لٹایا ہوا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر وہ سارے گرم کپڑے اور ضروری سامان جو ماں کے لیے خریدے تھے اس بھکارن کو دے دیے اور ایک چائے کے کھوکھے کے نزدیک چائے پینے کی غرض سے بیٹھ گیا۔

اچانک پشت کی جانب سے کسی نے میری آنکھیں بند کر دیں، بعد میں پتہ چلا کہ وہ

میرے پرانے دوست سرفراز علی تھے جو ایک بڑے فوٹو گرافر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اس موقع پر ایسی تصویریں اتارنے آئے ہیں جو ہمارے ملک کے سیاسی رہنماؤں کو آئینہ دکھائیں گی۔ میرے پوچھنے پر وہ بولے۔ ''ہمارے ملک میں بھیک مانگنا ایک پیشہ ہے۔ یہ بھکاری پروفیشنل اداکاروں سے بہتر اداکاری کرتے ہیں۔ یہ فطری اداکار ہیں انھیں کسی فلم یا ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ میں اداکاری کے گر سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اسکینڈل سامنے آتے ہیں۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ گزشتہ سال حج کے موقع پر سعودی حکومت نے بھکاریوں کا ایک بڑا ریکٹ پکڑا تھا جو کلکتہ اور ممبئی سے بھیک مانگنے کے لیے روانہ کیے گئے تھے۔ جانتے ہو! ان بھکاریوں کو سامنے والے کی نفسیات کا پورا علم ہوتا ہے۔ رو، رو کر، گڑگڑا کر، گانے گا کر ایسی اداکاری کر گزرتے ہیں کہ سامنے والے کو جیب سے پیسہ نکالنا ہی پڑتا ہے۔ ابھی ابھی کچھ اسنیپ لیے۔ سڑک پر بچے کو لٹا کر وہ رونے لگی...... ''بچے کو دودھ پلانا ہے...... بھوکا ہے بابو جی......''

لیکن میری نظر اس کے پاس رکھے خوبصورت پیکٹ پر گئی۔ میں نے پوچھا یہ کہاں سے لے آئی؟ تو بولی ''ایک بابو جی دے گئے ہیں۔''

''کیا نئے نئے کپڑے تھے۔ مجھے کچھ شک ہوا تو میں نے پولس کو خبر کرنے کی کہی۔ اتنا سننا تھا کہ وہ بچے کو اٹھا سامان لے کر رفو چکر ہوگئی۔'' سرفراز نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا یہیں نزدیک میں ایک اندھی ہے صبح سے شام تک اس کا مونو ایکٹنگ چلتا رہتا ہے۔ آج اسی کی Snaps لوں گا۔''

''میں نے اندھی کے طرز عمل پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ جسے لوگ اداکارہ سمجھ رہے ہیں وہ ذہنی طور پر ماؤف دماغ کوئی غمزدہ ہے۔ پورے جسم پر چوٹ کے نشان تھے۔ سر پر رنگ برنگی پٹیاں بندھی تھیں وہ گہری چوٹ کے سبب بندھی ہوں گی نہ کہ اداکاری کرنے کے لیے، جو بھی کپڑا کہیں سے مل گیا ہوگا اس نے ایک کے اوپر ایک پہن لیا۔ میں پوری طرح اس ضعیفہ کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک وہ بھاگی اور پاس کی چٹان سے ٹکرا گئی اسی لمحہ میرے منہ سے آواز نکلی ''اماں'' اور میں نے بھاگ کر اسے سنبھالا۔ اس چٹان کو دیکھ کر دو سال قبل کا منظر یاد آگیا یہی وہ جگہ تھی جہاں اماں سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ درد کے احساس نے اس کے لبوں کو جنبش دی زبان میں حرکت ہوئی اور ایک جملہ میری سماعت سے ٹکرایا۔ ''بیٹا عظیم......! آخر تو نے ماں کو ڈھونڈ ہی لیا۔''

ہاں...... ہاں...... عظیم اسی ضعیفہ کے بیٹے کا نام تھا۔ مجھے پوری طرح یاد آچکا تھا۔ لیکن ان دو سالوں میں اتنے دکھ اٹھانے پڑے کہ اماں کی ہیئت ہی بدل گئی، اور لوگ اسے اداکاری اور مونو ایکٹنگ کا نام دینے لگے۔ یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر چوما اور چھو کر بد بدانے لگی۔ ''بیٹا میں تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اندھی ہوگئی ماں تمھارے انتظار میں ہی زندہ ہے کہاں چلے گئے تھے تم مجھے اکیلا چھوڑ کر......؟ میرا دل کہتا تھا کہ ایک دن تم ضرور آؤ گے۔ اچھا بتاؤ بہو کیسی ہے......؟ ٹھیک تو ہے نا......؟ میں نے مکان کے کاغذ پر انگوٹھا لگا دیا ہے۔ تو نے تو کاغذ دیکھ لیا نا......؟'' وہ کچھ دیر تک پر سکون رہی پھر اٹھی اور گرتی پڑتی پاس میں رکھی گٹھری اٹھا لائی۔ میں نے جو گرم شال دیا تھا اسی کی گٹھری اس نے بنا لی تھی۔ وہ گٹھری مجھے دیتے ہوئے بولی ''بیٹا......! ماں کا سب تیرا ہے۔ بھیک مانگ کر جمع کیا ہے...... سب اسی میں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ گلے لگا کر میرا سر سہلانے لگی اور میرے کندھے پر سر رکھ کر خاموش ہوگئی۔ میں نے بار بار اسے آواز دی...... لیکن...... اماں...... اپنے بیٹے سے مل کر واپس جا چکی تھی۔!!

☆☆☆

بیٹا

ایک لمبے عرصے کے بعد وہ اپنے علاقہ کی طرف لوٹ رہا تھا۔ٹرین تیز رفتار تھی۔ وہ پیچھے بھاگتے مناظر میں کھویا ہوا تھا۔شام ڈھلتے ڈھلتے رات میں تبدیل ہوگئی تھی۔ مسافر اپنی اپنی برتھ پر نیند کا مزہ لے رہے تھے لیکن اس کی آنکھوں سے نیند روٹھی ہوئی تھی۔ دل بہلانے کے لیے وہ گنگنانے لگا جو بچپن میں ماں اسے سلانے کے لیے لوری گاتی تھیں ؎

پڑھ کر نام کرو گے بڑھ کر
جج کمشنر ہو گے پڑھ کر
دھوم سے تیری شادی رچاؤں
گوری چٹی دلہن لاؤں
گود رکھلاؤں تیرے بچے
سوجا سوجا میرے بچے

اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ آنسوؤں کے قطرے آنکھوں کے دریچے میں جھلملانے لگے اور چند ہی لمحوں بعد دھندلی یادوں کا ایک سلسلہ ذہن کے پردے پر دستک دینے لگا۔

جب بہت چھوٹا تھا اسی وقت والد ایک ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوگئے۔ میرے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا لیکن توہم پرستی کے شکار لوگوں نے والد کی ہلاکت کو میری موجودگی سے منسوب کردیا اور اسے منحوس اور نہ جانے کیا کیا لقب دیے گئے۔ بچے کی پرورش اور طویل زندگی کا خیال کرکے ماں کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ لیکن جس مقصد سے ماں نے قدم اٹھایا تھا شاید اس کے لیے مفید ثابت نہ ہوا۔ نئے والد سے وہ شفقت و ہمدردی نہیں ملی جس کی ضرورت

اسے تھی اسی درمیان وقت کے ساتھ ایک اور بھائی نے جنم لے لیا۔نوزائیدہ کی آمد اس کے لیے مزید نفرت کا ذریعہ بن گئی وقت گزرتا رہا اور ایک دن والدہ نے بھی داغ مفارقت دے دیا۔لمبی علالت کے بعد اب وہ ابدی نیند سو رہی تھیں۔میت کو دالان میں تخت پر لٹایا گیا تھا، پیروں کے انگوٹھے کو دھاگے سے باندھنے کے بعد ماں کے ہاتھ کو سیدھا کیا گیا تھا ایسا کرتے وقت اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے پلکیں بوجھل ہونے لگیں آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا اور صبر کا باندھ ٹوٹ گیا......

''ماں تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ بیٹا ایک دن آئے گا کہ تم میرے نزدیک کھڑے رو رہے ہو گے اور تمھاری آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچے گی۔ ماں! بولو...... کچھ تو بولو...... تمھارا یہ بیٹا جسے لوگ منحوس ہونے کا طعنہ دیتے ہیں! جس سے نفرت کرتے ہیں، آج تمھارے بغیر بالکل تنہا ہو گیا ہے۔ ماں! اب کون تمھارے اس بیٹے کو پیار سے آم کھلائے گا۔میرے گیتوں کو کون سنے گا؟ ماں! یہ وہی ہاتھ ہیں جس نے خوبصورت اردو لکھنا سکھایا۔ یہ وہی ہاتھ ہیں جو بچپن میں مجھے چلانے کے لیے سہارا بنتے تھے اتنا ہنر سکھانے والے ہاتھ آج ساکت ہیں۔'' وہ دیوانوں کی طرح میت سے لپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہاں پر موجود لوگوں نے سمجھایا تھا اب دعا کرنے کا وقت ہے والدہ کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔

گھر میں سناٹا تھا اس کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔ بھائی اور والد اخلاقی رشتوں کو بھی نبھانے میں تنگ دل ثابت ہوئے تھے۔ بے پناہ محبت کرنے والی ماں کی یادیں ہی اس کا سرمایہ تھیں۔ اکثر والد اور بھائی کی نفرت آمیز نظروں سے تنگ آ کر پکار اٹھتا: ''ماں! تم کہاں ہو۔'' اتنے برے سلوک کے باوجود وہ اپنے سوتیلے والد اور بھائی سے اچھی طرح پیش آتا۔لیکن ستم ظریفی یہ کہ اس کی فرمانبرداری بھی والد کو پسند نہ تھی۔اس طریقۂ کار سے کچھ لوگ اس کے والد پر تنقید کرتے مگر وہ انھیں منع کرتا۔اور دل ہی دل میں اپنی کم نصیبی پر روتا۔ایسے لمحوں میں ماں کی یاد اور زیادہ آتی تو رات کی خاموشی میں ماں کی قبر پر سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتا اور مغفرت کی دعا کرنے کے بعد دل کو سکون ملتا۔قبرستان سے گھر لوٹا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا اس کے کانوں سے آواز ٹکرائی ''پتہ نہیں یہ بوجھ میرے سر سے کب اترے گا۔ کہیں نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ والد اپنے بیٹے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ بھائی کی آواز آئی۔'' آخر بھائی صاحب کب

تک یہاں رہیں گے؟" اس طرح کی باتیں سن کر اس کے دل کو ٹھیس لگی اور اس نے برابر والے کمرے میں داخل ہو کر والد سے پوچھ ہی لیا۔ "ابا! میرے متعلق آپ لوگ ایسا کیوں سوچتے ہیں، آخر مجھ سے آپ لوگوں کو کیا شکایت ہے۔ کیا میں نے کبھی آپ کی نافرمانی کی، کیا اس بھائی کو اپنا نہیں سمجھا......؟"

"جنید تم غلط سمجھ رہے ہو...... بات یہ ہے کہ اب تمھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونا چاہیے۔ آخر کب تک بیکار بیٹھے رہو گے۔ باہر نکلو۔ دیکھو دنیا کتنی بڑی اور کیسی ہے پھر تمھیں خود اندازہ ہو جائے گا۔؟" والد نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"اچھا تو اب آپ مجھے گھر سے بھی بے دخل کرنا چاہتے ہیں...... ورنہ کام تو یہاں رہ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔" اس نے پہلی بار والد کو جواب دیا اور ایسے سفر پر نکل گیا جس کی منزل کا خود اسے پتہ نہ تھا۔ دور ہونے کے بعد بھی اس کے دل میں والد اور بھائی کے لیے کوئی کجی نہ تھی۔ دوسرے ذرائع سے وہ اپنے گھر کا حال معلوم کرتا رہتا تھا کیوں کہ وہاں سے اس کی ماں کی یادیں جڑی تھیں۔ بہر حال وہ اس کی ماں کا گھر تھا۔ انھی خیالوں میں ڈوبا وہ دور تک ماضی کی خار دار جھاڑیوں میں الجھتا جا رہا تھا کہ برابر سے گزرتی ایک تیز رفتار ٹرین کی آواز نے اسے چونکا دیا اور خیالوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ایک مسافر کافی دیر سے اس کے طرزِ عمل سے متاثر ہو رہا تھا۔ آخر اس نے خاموشی توڑی۔ "آپ کہاں جائیں گے......؟"

"والد سے ملنے جا رہا ہوں۔" ایک مختصر سا جواب دے کر وہ خاموش ہو گیا۔

"اگر برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں......؟" مسافر نے کہا۔

"بے تکلف ہو کر پوچھیں......"

"آپ کا گھر کہاں ہے......؟" مسافر نے دریافت کیا۔

"میرا کوئی گھر نہیں ہاں ایک مکان ہے جس میں رہتا تھا" اس نے جواب دیا۔ جواب سن کر مسافر حیران ہوا۔

"کیا گھر اور مکان میں فرق ہوتا ہے۔؟" مسافر نے دوسرا سوال کیا۔

"ہاں! فرق ہے" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "مکان تو اینٹ اور گارے سے تیار ہوتا

ہے لیکن گھر اسے کہتے ہیں جہاں انسان کو اپنے موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی اپنی حیثیت ہوتی ہے۔ جہاں ماں کی ممتا، باپ کی شفقت اور بھائی بہن کا پیار ہوتا ہے۔ جہاں قدم رکھتے ہی محسوس ہوتا ہے سورج کی تمازت سے نکل کر ٹھنڈے سائے میں آگئے ہیں۔''

مسافر بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے پھر پوچھا...... ''کیا آپ کے مکان میں کوئی نہیں رہتا۔''

''ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کو چھوڑ کر سب ہیں۔''

''ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔؟'' مسافر نے کریدا۔

''ماں اب اس دنیا میں نہیں اس لیے ممتا کا سایہ نہ رہا۔''

''اور والد......؟'' مسافر نے ٹکڑا لگایا۔

''ان کی شفقت کا سایہ بہت تنگ اور محدود ہے۔''

''شاید آپ کچھ چھپا رہے ہیں......'' مسافر نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

''چھپانے والی کوئی بات نہیں۔ عام طور پر...... سوتیلے باپ کا جو رویہ ہوتا ہے اس کا شکار رہا لیکن میرے اندر میری ماں کی تربیت اور اخلاق کا جز ہے اس لیے میں ہر بڑے کی عزت و احترام کرنا فرض سمجھتا ہوں یہی وجہ ہے کہ والد نے مجھے خبر دی تھی کہ وہ حج کو گئے ہیں اور کل ہی وہ لوٹ رہے ہیں لہٰذا ان سے ملاقات کو جا رہا ہوں۔''

دونوں باتوں میں اپنا وقت کاٹ رہے تھے۔ مسافر نے اخلاقاً سگریٹ پیش کی۔ جسے اس نے انکار کر دیا۔ مسافر نے سگریٹ کا دھواں ہوا میں چھوڑا۔

''ایسا لگتا ہے آپ کو اپنی ماں سے بہت پیار تھا۔؟''

''یہ سچ ہے کہ میری ماں مجھے بہت چاہتی تھیں۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھتی تھیں میری دل آزاری نہ ہو ہمیشہ ان کی یہی کوشش ہوتی تھی، لیکن ان کے جانے کے بعد پیار لفظ میرے لیے بے معنی ہو گیا ہے۔ وفات سے چند ماہ قبل انھوں نے مجھے وصیت کی تھی: ''بیٹا! میری زندگی کا بھروسہ نہیں مجھے احساس ہے کہ جو ممتا تمھیں مجھ سے ملنی چاہیے وہ میرے ہی فیصلے کی وجہ سے تقسیم ہو گئی۔ تمھیں دینے کے لیے میرے پاس تو کچھ نہیں یہ ایک گھر ہے جو تمھارے والد نے میرے نام کر دیا تھا اس کے تنہا مالک تم ہی ہوتا کہ مستقبل میں تمھیں کوئی نکال نہ سکے۔ اور بڑے

محتاط لہجے میں کہا تھا جب تک میری زندگی ہے میرے ساتھ دل بھر کے کھالو بعد میرے یہ گھر تمھارے لیے اجنبی ہو جائے گا۔''

سوچتا ہوں کہ آخر انھوں نے مجھ سے ایسا کیوں کہا......؟''

ٹرین اسٹیشن پر رکی اور وہ تیزی سے باہر نکلا، آٹو رکشہ کے ذریعہ جیسے ہی وہ ایئر پورٹ پہنچا اس کے والد باہر نکل رہے تھے۔ وہ ان سے بغلگیر ہوا۔ والد کے رویہ سے وہ خوش تھا اور اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ والد کے مزاج میں تبدیلی آ گئی ہے۔ لیکن ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ...... گھر میں موجود لوگوں نے ایسا سلوک کرنا شروع کیا جیسے وہ گھر کا فرد نہیں کوئی ناپسندیدہ شے ہے۔ گھر کے افراد نے بالکل اچھوت بنا دیا...... والد اپنی پرانی روش پر آ گئے۔ ایک بار پھر وہ سرگوشیاں کر رہے تھے: '' بیٹے! ہوش کے ناخن لو۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم جس گھر میں رہتے ہیں وہ جنید کے نام ہے۔ ہمارا اپنا اب تک کوئی گھر نہیں ہے خدانخواستہ اس کو معلوم ہو گیا تو وہ ہمیں گھر سے نکال سکتا ہے ایسے میں ہم سب لوگ کہاں جائیں گے۔؟''

جنید کے کانوں میں جب یہ آواز پہنچی تو اس کے دل کو بہت ٹھیس لگی۔ وہ سوچنے لگا میرے اخلاق و فرمانبرداری کے باوجود یہ صلہ......؟ اس نے فوراً واپسی کا ارادہ کر لیا۔ بھاری قدموں سے وہ کمرے میں داخل ہوا اور والد سے مخاطب ہوا:

''ابا! آپ کو فکر مند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں اور نجمی تو میرا بھائی ہے۔ آپ نے تو پہلے ہی مجھے اس گھر سے نکال دیا ہے۔ یہ گھر میرے نام ہے کیا آپ سمجھتے ہیں مجھے اس کا علم نہیں ہے؟ نہیں ابا! ماں نے میری مرضی کے خلاف یہ گھر میرے نام کیا تھا۔ میں نے اس وقت ان سے کہا تھا کہ میرے دوسرے بھائی بھی تو ہیں لیکن وہ آپ کے رویے سے اتنی دل برداشتہ تھیں کہ آج کے واقعات کو وہ تصور کی عینک سے اس وقت دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے مجبور کیا تھا۔ لیکن میرا ظرف یہ تھا کہ میں یہ بات زباں پر بھی نہیں لایا۔ مجھے نکال دیا گیا تو میں ایسے چلا گیا جیسے مالک مکان میں نہیں آپ لوگ ہیں۔ میں نے جسے باپ کہا، جنھیں بھائی کہا میں آنکھیں ملا کر یہ کہتا کہ مکان میرا ہے۔ نہیں میں اتنا نالائق نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا میں خاموشی سے چلا گیا۔ اگر ابا کے حجِ بیت اللہ جانے اور آنے کا علم نہ ہوتا تو میں آتا ہی کہاں۔ آپ نے اب بھی یہ کیوں سوچ لیا کہ میں آپ لوگوں کو نکال دوں گا...... کبھی نہیں...... اس لیے میں کل ہی یہ گھر بھی آپ کے نام منتقل کر دوں

گا...... ایک بیٹا اپنے باپ کو بے گھر کردے پھر وہ بیٹا ہی کیسا...... نہیں ابا! آپ یہیں رہیں گے اپنے اسی گھر میں۔''

والد اور نجمی اس کی باتیں سن کر شرمندہ ہو گئے اور فرطِ جذبات سے والد نے جنید کو سینے سے لگالیا...... ''نہیں بیٹے! تم اب کہیں نہیں جاؤ گے......''

''ہاں بھائی جان! ہمیں معاف کردیں۔ آپ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔'' نجمی بھی بھائی کے سینے سے لپٹ گیا۔

''ارے پگلے! میں کب تم لوگوں سے دور رہا لیکن اللہ نے جہاں روزی لکھ دی ہے وہاں تو جانا ضروری ہے۔''

سبھی کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں رقص کر رہی تھیں۔

☆☆☆

آتنک وادی

وہ رمضان المبارک کی ۱۹؍ویں تاریخ تھی، جمعہ کا دن۔ بازار میں معمول کے مطابق خوب چہل پہل اور رونق تھی۔ سبھی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہر دوکان سلیقے سے سجائی گئی تھی۔ رمضان المبارک کا دوسرا عشرۂ مغفرت اپنے اختتام پر تھا اور جہنم سے بچنے کا عشرہ آنے کی دستک دے رہا تھا، سڑک پر لوگوں کا ہجوم سیلاب کی مانند رواں تھا۔ کہیں سوئیاں، کہیں پھینی، کہیں افطار سے متعلق سوکھے سامان دستیاب تھے۔ اس پر جمعہ کا دن لوگ ویسے بھی رمضان میں جمعہ کو مزید اہمیت دیتے ہیں اس لیے گلی، محلّہ کی ہر مسجد وقت سے پہلے ہی پر ہوتی نظر آرہی تھی۔

اچانک منظر بدل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری دوکانیں بند ہوگئیں، گلیوں و محلوں کی رونق جاتی رہی۔ ایک پر ہول سناٹا چاروں طرف چھا گیا۔ دن کے گیارہ بجے ہی رات کے بارہ بجے کا احساس ہورہا تھا۔ اگر کوئی آواز تھی تو پولس کے بوٹوں کی اور گاہے گاہے چلتی ہوئی گولیوں کی سنسناہٹ فضا میں پھیلی خاموشی کو چیرتی ہوئی نکل جاتی۔ اچانک حالات کی یہ تبدیلی اسے سمجھ میں نہ آئی۔ وہ تنہا خریداری کے لیے نکلا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگ کر اپنے گھر کا رُخ کرتا پورا علاقہ پولس چھاؤنی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ گلی، نکڑ، سڑک اور بازار ہر جگہ خاکی وردی ہاتھوں میں آتشی اسلحہ لیے خونی آنکھوں سے گردونواح پر نظر گڑائے ہوئے تھی جیسے بلّی چوہے کی تاک میں اپنے پنجوں کے بل آہستہ آہستہ شکار کی طرف جھپٹنے کو بڑھتی ہے۔ وہ پاس کے ہی ایک مکان کے کونے میں دبک کر کھڑا تھا کہ یکایک عقب سے کسی نے اسے کھینچ لیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ بند ہوگیا۔ اس نے دیکھا ایک خاتون نے اسے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ "بیٹا......! تو اس وقت باہر کیسے نکل گیا۔ دیکھتا نہیں آتنک وادی چاروں طرف گھوم

رہے ہیں۔ اگر میں تجھے اندر نہ کرتی تو تو بھی......'' اور وہ بالکل ساکت ہوگئی...... باہر دروازے پر کوئی زور زور سے دستک دے رہا تھا۔ ''دروازہ کھول...... دروازہ نہیں کھلا تو توڑ دیا جائے گا۔'' خاتون نے اسے ایک پلنگ کے پیچھے چھپا دیا اور کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ خاکی وردی والوں کی بھیڑ بے روک ٹوک کمرے میں داخل ہوگئی چاروں طرف گھورنے کے بعد ان میں سے ایک نے کرخت آواز میں پوچھا ''کوئی آتنک وادی تو نہیں چھپا ہے تیرے یہاں۔''

''نہ......نہ......نہیں۔'' وہ خاتون سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ارے ان مسلمنٹوں کا کوئی بھروسہ نہیں یہ سالے بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں اتنے کٹتے جلتے ہیں مگر ان کی آبادی کم ہی نہیں ہوتی۔'' دوسرے وردی والے نے مذاق اڑاتے ہوئے اور دانت پیستے ہوئے کہا پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ خاتون نے تیزی سے دروازہ بند کیا چہرے پر آئے پسینے کو اپنے آنچل سے پونچھتی ہوئے اسے باہر نکالا۔ ابھی وہ اس سے کچھ پوچھتی کہ باہر گلیوں میں گولیاں چلنے کی آوازیں فضا کو تھرّا رہی تھیں۔ وہ سرعت کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا...... ''یہ کیا کر رہے ہو...... دروازہ نہ کھولنا۔'' خاتون چیخی۔

''تو کیا کروں، میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ میرے بھائی بہن ماں سب میرے انتظار میں پریشان ہوں گے۔''

''تمھیں دکھائی نہیں دیتا گولیاں چل رہی ہیں۔ یہ حماقت نہ کرو۔'' خاتون نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ''ابھی حالات کشیدہ ہیں تمھارا باہر جانا مناسب نہیں مجھے ڈر ہے کہ اگر تم باہر گئے تو یہ درندے تمھارا وہی حال کریں گے جو بھی......'' یہ کہتے ہوئے خاتون کے آنسو جاری ہوگئے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے خاتون کو دیکھا۔

''کیا بات ہے۔ آپ کس کی بات کر رہی ہیں۔'' وہ گویا ہوئی۔

''آج سے دو سال قبل اسی طرح ایک دن پورا محلّہ چھاؤنی میں تبدیل ہوگیا تھا۔ کوئی دہشت گرد بھاگتا ہوا اسی طرف آگیا تھا پولس چپہ چپہ پر اس کی تلاش کر رہی تھی۔ دہشت گرد کے شک میں سیکڑوں نوجوان، بوڑھے اور کم سن بچوں کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ میرا بچہ جو چودہ برس کا تھا ٹیوشن پڑھنے گیا ہوا تھا۔ واپسی میں اس نے یہ منظر دیکھا تو کسی جگہ چھپ گیا۔ دن بیتا، شام ہوئی یہاں تک کہ رات ہوگئی۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ کاشف اب تک نہ لوٹا تھا......'' اس سے

پہلے کہ خاتون آگے بولتی اس نے پوچھا...... ’’اور آپ کے شوہر......؟‘‘

’’وہ تو گلف میں رہتے ہیں......‘‘

’’وہ تو گلف میں رہتے ہیں......‘‘

’’تو آپ کا بچہ کب آیا......؟‘‘

’’رات کافی ہو چکی تھی۔ میرا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسواس ابھر رہے تھے۔ میں نے یہ جان کر کہ اب سکون ہو چکا ہے دروازہ کھول کر دیکھنا چاہا کہ یکا یک گرج دار آواز ابھری ’’دروازہ بند کرلو ورنہ گولیاں لگنے کا خدشہ ہے۔‘‘ میں نے فوراً دروازہ پھر سے بند کرلیا اور دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرنے لگی۔ باہر سے باز گشت سنائی دے رہی تھی۔ وہ رہا...... دیکھو بھاگنے نہ پائے...... وہ دیکھو اندھیرے میں چھپنے کی کوشش میں ہے...... وہ نکلا...... ادھر...... ہالٹ......‘‘ ایک کرخت آواز آئی لیکن چند ہی لمحوں بعد آواز ابھری فائر...... اور چاروں طرف سے بندوقیں خالی ہو گئیں۔ ایک زوردار چیخ فضا میں گونجی اور خاموش ہو گئی۔ باہر کون مرا کسے گولی لگی پتہ نہیں چلا۔ رات کے اندھیرے میں بوٹوں کی آواز پھر ابھری۔ ساتھ میں تبصرہ بھی۔ مار گرایا سالے کو آخر ڈھیر کر دیا۔ چلو جلد از جلد رپورٹ کرنا ہے کہ آپریشن کامیاب رہا۔ ایک شاطر دہشت گرد کو مار گرایا گیا ہے۔ دیش کے دشمن کو دیش بھکتوں نے ختم کر دیا۔ رات کے سناٹے میں لاش گھسیٹنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جیسے جیسے بوٹوں کی آواز دور ہوتی گئی محلے اور گلیوں کے مکانوں کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ انھیں میں ان آنکھوں نے بھی دیکھا ایک ۱۵ ر سال کے نوجوان کی لاش پولس بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہی ہے۔ اگلی صبح ہر ٹی۔ وی چینلز چیخ رہا تھا ’’شہر کے شاطر دہشت گرد اتنا بڑا شاطر تھا کہ اسلحہ کے ساتھ اسکول بیگ میں اپنی کتابیں رکھے ہوئے تھا۔‘‘ ٹی وی کا اینکر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ مرنے والے کا نام کاشف ہے۔ جس کا تعلق دنیا کے بڑے دہشت گرد گروہ سے تھا۔ یہ دیکھتے ہی میری چیخ نکل گئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ بیٹا اس واقعہ کو گزرے دو سال ہو چکے ہیں اور آج جب پھر وہی حالات سامنے ہیں تو میں نے تمھیں اندر کھینچ لیا۔ تاکہ میرے بیٹے کی طرح کسی اور کا بیٹا دہشت گرد کے شک میں شکار نہ ہو جائے۔‘‘ خاتون کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ اس نے خاتون کو تسلی دی۔ صبح ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ اس نے خاتون سے اپنے گھر جانے کی

اجازت چاہی اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ جیسے ہی اپنی گلی میں قدم رکھا گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ ہجوم میں سے اس کی ماں چیختی ہوئی نکلی ''بیٹا...... میرا لعل...... تو کہاں تھا دیکھ تیرے بھائی اور والد کو یہ خاکی آتنک وادی مار گئے۔ ہائے میرا بیٹا...... ہائے...... میرا شوہر یا اللہ ان ظالموں پر اپنا قہر تو کب نازل کرے گا۔ وہ دھاڑیں مار رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا یہ انسان نہیں تنکے ہیں۔ جو کوڑا کرکٹ کی طرح اڑ گئے۔ کتنا افسوسناک ہے انسان ہوتے ہوئے کوڑا کرکٹ بن جانا۔

جب تک ہمارا معاشرہ کوڑا کرکٹ بنا رہے گا بے قصور انسان لاش بنتے رہیں گے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس ہجوم کا حصہ نہیں بلکہ ایک منفرد انسان ہے......!!

☆☆☆

آیئے، روڈویز......؟؟

آفس سے نکلنے کے بعد میں نے سیدھا گھر کا رخ کیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سڑک پر آ گیا۔ شام کا وقت تھا بازار میں بھیڑ تھی، ہر کوئی ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اس شہر کی ٹریفک دوسرے شہروں سے الگ ہے، نہ سائیکل میں گھنٹی، نہ رکشہ میں روشنی کا انتظام، ''شی شی'' کی آواز منہ سے نکالتے سائیکل سوار، ہٹو...... چلو...... بچو کی آواز لگاتے رکشہ پلر، ان ہی بھاگتے ہوئے لوگوں کے درمیان، بھیڑ کا ایک حصہ میں بھی تھا۔ بوجھل قدموں سے سڑک کے کنارے چلا جا رہا تھا......

''روڈویز؟'' آیئے روڈویز......!'' کی آواز نے مجھے اپنی طرف مخاطب ہونے کے لیے مجبور کر دیا۔ میں نے گردن گھمائی، پندرہ سولہ سال کا لڑکا جس کے پیر مشکل سے پیڈل تک پہنچ رہے تھے، رکشہ کو سرکاتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ ''انکل روڈویز تک چھوڑ دوں؟'' وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا۔ میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں تو اس کے معصوم چہرے اور کم عمری میں جینے کی جدوجہد کے لیے اس کے عزم کو دیکھ کر حیرت زدہ تھا، سوچ رہا تھا یہ اس بچے کا حوصلہ ہے یا اس کی مجبوری......؟ یہ عمر تو کھیلنے اور پڑھنے کی ہے پھر...... یہ......؟ اس کے ہاتھ میں قلم و کتاب کے بجائے رکشہ کا ہنڈل، پیروں میں فٹ بال یا ہاکی کے بوٹ کے بجائے رکشہ کے پہیوں کو گھمانے کے لیے پیڈل......؟ کیا ماجرا ہے۔ بچپن میں ہی اس کے بچپن کو کون چھین رہا ہے

......کون......؟ ایک ساتھ کئی سوالات میرے ذہن کے دروازے پر دستک دے گئے۔ میں کچھ اور سوچتا کہ دفعتاً اس نے دوبارہ آواز دے دی۔

''انکل......! روڈویز؟'' اور میں خیالوں کے بادلوں کو چیرتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ ملتجی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''نہیں بیٹے مجھے روڈویز نہیں جانا...... میں نزدیک ہی رہتا ہوں'' میرا جواب سن کر بچے نے مایوسی سے اس طرح سر کو جنبش دی جیسے کہہ رہا ہو یہ امید بھی بر نہیں آئی۔ وہ منہ لٹکائے آگے بڑھ گیا لیکن اس کی مایوسی کے احساس نے میرے جسم میں سستی پیدا کر دی، مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے آسے آواز دے کر رکنے کا اشارہ کیا۔

اور نہ جانے کیوں اس کے رکشہ پر سوار ہو گیا۔ لڑکپن سے جوانی کی طرف بڑھتی عمر نے ساری طاقت لگا کر رکشہ کھینچنے کی مشق شروع کر دی۔ ایک لمحہ کے لیے خیال آیا کہ یہ میری زیادتی ہے کہ میں ایک تندرست آدمی، اس کم عمر بچے کی رکشہ پر آ بیٹھا۔ کہیں انجانے میں اللہ کے اس بندے کو اذیت تو نہیں دے رہا......؟ دوسری طرف یہ خیال کہ یہی سوچ سب کی ہو جائے تو پھر اس بچے کو روزی کیسے ملے گی؟ وہ اپنے جسم کو کچھ اس طرح حرکت دے رہا تھا کہ رکشہ رفتار پکڑ لے۔ میں نے اسے سمجھایا۔

''بیٹے......! آرام سے چلو مجھے کوئی جلدی نہیں۔'' بچے کی محنت اور اس کے حوصلے کو دیکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ کسی خاص مجبوری نے ہی اس کو یہ مشکل راستہ دکھایا ہے ورنہ کوئی ماں یا باپ اپنے جگر گوشے کو یوں زندگی کی چکی میں پسنے کو نہیں چھوڑ سکتا۔ چلتے چلتے میں نے اس سے پوچھا ''بیٹے تمھارا نام کیا ہے؟'' میرے اس سوال پر وہ چونکا نہیں، بلکہ پرسکون لہجے میں بولا۔ ''غریب، غریبی نے ہمیں اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور رکشہ کھینچتا رہا۔ وہ کبھی کبھی اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کے پسینے کو خشک کر لیتا۔ اس کا جواب سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ یقیناً یہ جواب تجربے نے دیا تھا۔ عام طور پر ہم سوچتے ہیں کہ عمر دراز انسان ہی تجربہ کار ہوتا ہے۔ لیکن اس نوعمر رکشہ والے نے اس فکر کو جھٹلا دیا۔ حالات کی گردش کسی کو بھی تجربہ کار بنا دیتی ہے یہ اس روز محسوس ہوا۔

ہم شہر کی گنجان آبادی سے دور نکل آئے تو اچانک اس نے پوچھا۔

’’انکل آپ کو جانا کہاں ہے؟ آپ نے بتایا نہیں۔‘‘

’’ارے......؟ ہاں......! میں تو تمھیں یہ بتانا ہی بھول گیا۔‘‘ چونکتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

’’مجھے تم اسٹیشن پر چھوڑ دو۔‘‘

ریزرویشن کاؤنٹر سے ٹکٹ واپس لے کر اسٹیشن سے باہر نکلا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن واپسی کے لیے کوئی رکشہ نہیں تھا۔ وقت گزاری کے لیے اسٹیشن کے گیٹ پر چائے کی دوکان میں چائے پینے کے لیے بڑھا۔ چائے کا گلاس لے کر میں ابھی ہونٹ سے لگانے ہی والا تھا کہ اس نو عمر رکشہ پلر پر نظر پڑی جو ابھی کسی اور مسافر کو لے کر اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے اسے آواز دی، ایک لمحہ کے لیے وہ رکا، ہاتھ کے اشارے سے آنے کا وعدہ کر کے آگے بڑھ گیا، تھوڑی ہی دیر میں واپس آ کر وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور قمیص کی آستین سے چہرے کا پسینہ خشک کرتے ہوئے بولا۔

’’کیا بات ہے انکل واپس چلنا ہے کیا؟‘‘

’’ہاں...... واپس تو چلنا ہے لیکن چائے پی لوں۔‘‘

میں نے چائے والے کو ایک اور چائے اور دو انڈوں کا آملیٹ بنانے کا آرڈر دیا۔ دونوں چیزیں تیار ہو گئیں تو میں نے آملیٹ کی پلیٹ اور چائے کی پیالی اس معصوم محنت کش پر ترس کھا کر اس کی طرف بڑھا دی اور تحکمانہ انداز میں بولا ’’کھاؤ......‘‘

’’نہیں انکل...... نہیں۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گا، آپ چائے پی لیں پھر میں آپ کو لے کر واپس چلوں گا۔ تب تک مجھے آرام بھی مل جائے گا۔‘‘

’’دیکھو، تم یہ نہ سمجھنا کہ اس انڈے اور چائے کی وجہ سے تمھاری مزدوری میں کمی ہوگی۔‘‘ مگر وہ انکار کرتا رہا۔ بالآخر بہت سمجھانے پر وہ مان گیا۔ وہ آملیٹ کے ٹکڑوں کو منہ میں ڈالتے ہوئے مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

’’بیٹے تمھاری یہ عمر پڑھنے اور کھیلنے کی ہے پھر، تم یہ......‘‘ میری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بول اٹھا۔

''انکل غریبی کا کوئی بچپن نہیں ہوتا۔ اور یہ مجبوری ہے نا......؟'' وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا ''یہ اسے کھیلنے نہیں دیتی۔'' وہ کسی فلسفی کی طرح بول رہا تھا۔

''تمھارے والد کیا کرتے ہیں؟'' میرے اس سوال پر اس نے سر جھکا لیا تو میں نے دوبارہ کریدا ''تم خاموش کیوں ہو گئے؟ بولو......!''

''والد نہیں ہیں، والدہ اور چھوٹا بھائی ہے۔''

''کیا ہوا والد کو......؟''

میں نے دوسرا سوال کیا۔

''والد کو غریبی نے برسوں پہلے نگل لیا۔ وہ آئس کریم فروخت کرتے تھے۔ جاڑے کا موسم آتا تھا تو ٹھیلے پر پھل اور سبزیاں بیچتے۔ اس وقت میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ بہت شوق تھا کہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں گا، ملک وملت کی خدمت کروں گا۔ والد صاحب بھی میری حوصلہ افزائی کرتے۔ والدہ گھر میں ہی آس پڑوس کے کپڑے سیتی تھیں، ایک دن ایسا ہوا کہ شہر کی ناقص ٹریفک کے سبب سڑک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ سر سے شفقت کا سایہ ہٹ گیا۔ والدہ نے میری پڑھائی جاری رکھی لیکن......'' کہتے کہتے وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے ہمت بندھائی تو کہنے لگا۔

''انکل آج کل لوگ مزدور سے سخت محنت کے خواہش مند ہوتے ہیں لیکن محنت کا جائز معاوضہ دینا نہیں چاہتے۔ ایک مزدور اسی مقام پر بے بس ہو جاتا ہے۔ میں اپنے جسم کی طاقت فروخت کر کے روپے خریدتا ہوں اور جو لوگ ہم جیسوں کی بے بسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں وہ اپنے روپے کے عوض محنت خریدتے ہیں۔ کیا میری یہ بات غلطی ہے انکل؟'' وہ مجھ سے سوال کر رہا تھا اور میں نو عمری کی زبان سے نکلتے ہوئے جملوں میں انقلاب کی بو محسوس کر رہا تھا۔

''ہماری مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر لوگوں نے ماں کو سلائی کی کم اجرت دینا شروع کردی۔ ہماری مجبوری ہمارا مقدر بن گئی۔ ادھر اسکول کی فیس ادا نہ کرنے کے سبب میرا نام بھی کٹ گیا، تب میری ہمت ٹوٹ گئی، میں نے پڑھائی ترک کردی۔''

''تم نے اس سلسلے میں اسکول کے یا محلے کے ذمہ دار لوگوں سے بات کیوں نہیں کی؟ یہاں تو بڑے متمول اور دیندار لوگ رہتے ہیں یقیناً تمھاری مدد کریں گے۔ کیا تم ان سے

ملے......؟'' میرے اس سوال پر اس کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ پھیل گئی ''انکل ابھی آپ نے کیا کہا......؟ متمول اور دیندار؟ میں بتاؤں انکل ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ یہ امیری، یہ دینداری بھی ہمارے معاشرے میں ہاتھی کے دانت کی طرح ہے، کھانے کے لیے اور دکھانے والے اور۔ میں نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کئی ایسے لوگوں سے گزارش کی جو معاشرے میں امیر اور دیندار سمجھے جاتے ہیں لیکن انھوں نے ہمدردی کے چند میٹھے بول میرے کانوں میں انڈیل دیے اور ہتھیلی پر پانچ، دس روپے رکھ کر اللہ و رسول کے تعبیداروں میں نام درج کرالیا۔ جب دو وقت کا فاقہ ہوگیا، چھوٹا بھائی بھوک سے نڈھال ہوگیا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے اسے تسلی دی اور ایک ضمانت دار کے ذریعہ ایک چچا میاں سے رکشہ لی اور بیس روپیہ روزانہ کرایہ دینے کی شرط پر آج پہلی بار رکشہ چلانے نکلا ہوں کیوں کہ دو وقت سے میری ماں اور بھائی بھوکے تھے۔ آپ پہلے مسافر ہیں جسے میں نے اسٹیشن چھوڑا، اللہ کی رحمت سے ایک سو روپیہ مزدوری اب تک مل چکی ہے۔'' اس نے مجھے جیب سے روپے نکال کر دکھائے، اس کے چہرے پر خود اعتمادی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اس نے آملیٹ کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا ''انکل چلیں رات ہونے کو ہے، کھانے کا سامان بھی لینا ہے۔''

چائے اور آملیٹ کے پیسے ادا کر کے میں مختلف سوالات اپنے ذہن میں لیے آگے بڑھا اور ایک بار پھر اس معصوم محنت کش کے رکشہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے تیزی سے پیڈل گھمانا شروع کیے تو مجھ سے کہے بغیر نہیں رہا گیا۔ ''بیٹے رفتار دھیمی کرلو، آرام سے چلو، گھر ہی تو جانا ہے نا۔''

گھر پہنچ کر میں نے اسے بیس روپے دیے۔ ''نہیں انکل یہ بہت زیادہ ہے۔''

''بیٹے زیادہ نہیں ہے۔ یہ اجرت تمھاری واجب ہے تمھیں کافی دیر تک میں نے روکے رکھا، یہ سنتے ہی اس نے خاموشی اور خوشی سے مزدوری جیب میں ڈال لی اور تیزی سے آگے بڑھ گیا پھر کچھ ہی دور جا کر رکا اور رکشہ وہیں چھوڑ کر واپس آیا اور میرے قریب آ کر بولا ''انکل......! میں نے فیصلہ کرلیا ہے رات میں رکشہ چلا کر دن میں پڑھوں گا۔ ضرور پڑھوں گا۔'' یہ کہہ کر بڑے پرعزم انداز میں قدم بڑھاتا ہوا وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ آج جب برسوں کے بعد

میں نے اسے فوج کے میجر کی وردی میں دیکھا ہے اور اس نے فخریہ انداز میں مجھے اپنا تعارف کرایا ہے تو اس کا معصوم چہرہ میری آنکھوں میں گھوم رہا ہے اور "آیئے روڈویز......" کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

☆☆☆

تمغہ

یونیورسٹی میں جشن کا ماحول تھا۔ وسیع وعریض آڈیٹوریم طلبہ وطالبات سے بھرا ہوا تھا۔ سبھی اپنی نشست پر خاموشی سے بیٹھے تھے۔ جو دیر سے آرہے تھے وہ اپنی جگہ تلاش رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اعلان ہوا کہ مہمانِ خصوصی آچکے ہیں۔ چند ہی لمحہ بعد جلسے کی کارروائی شروع ہوگئی۔ ہال میں خاموشی طاری تھی۔ آج ان تمام طلبہ وطالبات کو اعزاز ملنے والا تھا جس کی حصول یابی کے لیے انھوں نے مہینوں محنت کی ہے، تحقیق کی ہے۔ ان تمام طالبات کے والدین بھی کتنے خوش ہوں گے جب ان کے نورِ نظر کو مختلف شعبہ میں تحقیق کی بنیاد پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جائے گی اور وہ اپنے مستقبل اور ملک کی ترقی کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیں گے۔ اس طرح ملک کو ایک نیا شہری ملے گا۔ اس شور وہنگامہ میں ایک نام بار بار لوگوں کی زبان پر آرہا تھا، کامران، لوگ سرگوشیاں کررہے تھے۔

دیکھنا تاریخ کے شعبہ میں اور یونیورسٹی ٹاپر کا اعزاز کامران اشرف کو ملے گا۔ ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ مہمانِ خصوصی آپہنچے۔ جلسے کی کارروائی وقت پر شروع ہوگئی۔ مہمانِ خصوصی صدرِ جمہوریہ نے افتتاحی تقریر کی۔ اس کے بعد باری باری سے تمام طلبہ وطالبات کو اسناد واعزاز دیا۔ اب ایک اہم اعزاز کا اعلان ہونے والا تھا تمام طلبہ وطالبات دل تھامے بیٹھے تھے۔ ہر ایک اس خیال میں ڈوبا تھا کہ وہ کون خوش نصیب ہے جو یونیورسٹی ٹاپر کا اعزاز حاصل کرے گا اور طلائی تمغہ اس کے گلے کی زینت بنے گا۔

ہال مکمل سکوت طاری تھا۔ خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز ابھری اور یکا یک ہال

تالیوں کی گونج سے بھر گیا۔ اناؤنسر نے دوبارہ نام کا اعلان کیا۔ اس سال تاریخ کے شعبہ میں اورنگ زیب عالم گیر کے مذہبی اصول پر بہترین تحقیق کے لیے کامران اشرف کو یہ اعزاز دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی یونیورسٹی میں اچھی کارکردگی کی بنیاد پر یونیورسٹی ٹاپر بھی قرار دیا جاتا ہے۔ ہال ایک بار پھر تالیوں کی آواز میں ڈوب گیا۔ کامران اشرف اسٹیج پر تشریف لائیں اور مہمانِ خصوصی سے اپنا طلائی تمغہ وسند قبول کریں۔ ایک دبلا پتلا خوبرو نوجوان خراماں خراماں اسٹیج تک پہنچا۔ تالیوں کی آواز عروج پر تھی۔ اس نے خاموشی سے اپنا اعزاز حاصل کیا۔ اس کے بعد صدرِ محترم نے اس کے گلے میں طلائی تمغہ پہنایا۔ اس وقت کامران کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ جلسے میں موجود لوگوں پر ڈالی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انسانوں کی اس بھیڑ میں اسے کسی کی تلاش ہے۔ اس کی نظر جیسے جیسے لوگوں کی طرف اٹھتی، طلبہ وطالبات زوردار تالیوں سے اس کا استقبال کرتے لیکن کامران اشرف کے کانوں میں وہ آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ تو ماضی کے گلیارے میں پہنچ چکا تھا، جہاں اس کا چھوٹا سا خاندان تھا اور خود وہ...... والد ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھے لیکن اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے بڑے حساس، وہ ہر وقت کامران اشرف کی پڑھائی کا دھیان رکھتے۔ اپنی قلیل آمدنی میں بھی اس کے تعلیمی معاملات میں کوتاہی نہیں کرتے۔ درجہ میں ماہانہ فیس کے لیے جو بل بچوں کو دیے جاتے اس سے قبل اس کی فیس ادا ہو جاتی۔ درجہ میں وہ واحد طالب علم تھا جسے وہ بل نہیں ملتا۔ اسے اب بھی یاد ہے۔ جب کسی معاشی پریشانی کے باعث اس کی فیس وقت سے قبل جمع نہ ہو سکی تو پہلی بار اسے بھی بل لینا پڑا اور جب گھر لوٹا تو والد نے پوچھا۔

”بیٹے کیا بات ہے؟ تم کچھ مایوس لگ رہے ہو۔؟“

”پاپا!...... “آج مجھے اچھا نہیں لگا۔“

کیوں بیٹے......؟ کسی نے کچھ کہا۔؟“

”نہیں!“

”پھر خاموش کیوں ہو؟“ والد نے سبب جاننا چاہا۔

”پاپا...... درجہ میں سب بچوں کو فیس کی بل دیے جا رہے تھے تو مجھے بھی دیا گیا۔ اس

سے پہلے تو میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا'' کامران نے کچھ خفگی کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''بیٹا...... !'' والد تھوڑا رک کر بولے۔'' وہ بات یہ ہے کہ اس بار میری تنخواہ وضع ہوگئی ہے۔ میں نے چند ضرورتوں کے لیے پیشگی لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وقت پر تمھاری فیس ادا نہیں کرسکا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ کل ہی تمھاری فیس ادا کردونگا۔ کامران کو قدرِ اطمینان ہوگیا۔

اس کے پاپا روزانہ صبح ساڑھے چار بجے اٹھتے، اسے پڑھاتے اور ایک گھنٹہ بعد منھ ہاتھ دھوکر ٹھٹھرتی سردی میں اپنے چہرے کو مفلر سے ڈھک کر سائیکل سے ٹیوشن کو نکل جاتے۔ نو بجے صبح واپس آتے۔ ناشتہ کے بعد اسے سائیکل پر سوار کر کے خود اسکول تک چھوڑتے پھر اپنی ڈیوٹی پر چلے جاتے۔ واپسی میں اسکول سے لیتے ہوئے گھر آتے اور شام پانچ بجے سے نو بجے رات تک مستقل ٹیوشن کرتے۔ اتنی بھاگ دوڑ صرف اس لیے تھی کہ ان کا بیٹا کامران اچھی تعلیم حاصل کرے اور اعلیٰ تعلیم کے بعد عظیم انسان بنے۔ ملک قوم، اور خاندان کا نام روشن کرے۔ وہ اکثر کہا کرتے'' دیکھنا میرا بیٹا ایک دن خوب نام کمائے گا۔ میں تو اسے اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے سب کچھ کروں گا۔ محلے والے عزیز واقرباء یہ بات سن کر ان کا مذاق اڑاتے لیکن وہ اپنی دھن کے پکے تھے۔

کامران درجہ بہ درجہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اسکول کے تمام جلسے میں اس کی شرکت ضروری تھی۔ یوم جمہوریہ ہو یا یومِ آزادی، گاندھی جینتی ہو یا یوم اطفال یا یومِ اساتذہ، ہر تقریب میں وہ شریک ہوتا۔ اسکول کے تمام اساتذہ کا وہ نورِ نظر بن چکا تھا۔ یوم جمہوریہ و آزادی کے موقع پر اس کی تقریر سننے کے لیے لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ جمع ہوتی تھی۔ ایک بار اپنے اسکول میں یومِ آزادی کے موقع پر اس نے جو تقریر کی تھی اس سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں جب اس نے کہا تھا...... ''قابلِ احترام سامعین! وہ ہم تھے جو اشفاق اللہ خاں بن کر پھانسی کے تختے پر جھول گئے، وہ ہم تھے جس نے بریگیڈیر عثمان بن کر کشمیر کی حفاظت کی تھی، وہ ہم تھے جو مولانا محمد علی جوہر بن کر برطانیہ سے آنکھ ملا کر پروانہ آزادی لینے کی بات کہی۔ وہ ہم تھے جو عبدالحمید بن کر پاکستانی ٹینکوں کا منھ موڑ دیا تھا۔ وہ ہم تھے جو کیپٹن حنیف بن کر کارگل کی جنگ میں اپنی جان کی

پہلی قربانی دی تھی ۔ ہم نے ہندوستان کے چپے چپے کو اپنے خون سے لال کر دیا ہے۔ اتنی قربانیوں کے بعد بھی کچھ لوگ ہمیں غدّار کہتے ہیں ۔ ہم وہ آنکھیں نوچ لیں جو ہمارے ملک کی سرحد پر حریص کی طرح اٹھیں گی اور ہم انھیں بھی نہیں بخشیں گے جو ہمیں غدار کہتے ہیں۔''......اور دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔

ایک چھوٹے بچے نے اتنی جذباتی تقریر کی کہ تمام لوگ حیرت زدہ تھے۔ دراصل یہ سبق بھی اس کے والد نے سکھایا تھا۔ اکثر ان تقاریب کے لیے وہی تقریر لکھ کر دیتے اور بڑی محنت سے پریکٹس کراتے۔ اسے وہ دن بھی یاد ہے، جب اس کی کامیابی اور ذہانت کے لیے اسکول کے سالانہ جلسے میں اردو زبان کی بہترین تقریر پر انتظامیہ نے طلائی تمغہ سے نوازا تھا۔ تمام اساتذہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس کے والد کو مبارک باد دے رہے تھے۔

''بھئی تنویر اشرف صاحب! مبارک ہو۔ ایک دن آپ کا یہ فرزند بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔ نہ صرف آپ کا بلکہ اپنے اسکول کا بھی نام روشن کرے گا۔'' یہ تاثرات تھے والد کے احباب اور اسکول کے اساتذہ کے لیکن جہاں نسیم سحر ہوتی ہے وہاں تیز و تند آندھیاں بھی چلتی ہیں، گرم ہوائیں بھی گردش کرتی ہیں۔ اگر بہت لوگ ذہانت اور کارکردگی سے خوش تھے۔ تو کچھ لوگ اس سے حسد بھی کرتے تھے۔ اس کے والد کی معاشی تنگی پر طنز کرتے تھے۔ ایک بار تو ان کے ایک عزیز نے حسد میں یہاں تک کہہ دیا کہ ''بھائی صاحب! آپ کا بیٹا کامران تو ہر وقت کرکٹ کھیلتا رہتا ہے، سڑک کے کنارے بتاشے و چاٹ کھاتا ہے، دیر رات تک محلے کے لڑکوں کے ساتھ گھومتے ہوئے میں نے دیکھا ہے۔ وہ کیا پڑھے گا۔ وہ آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ کیوں اپنی جان کو کھینچ رہے ہیں۔ اپنے لیے کچھ کریں۔

''ارشد میرا اپنا کون ہے؟ وہی تو ہے۔ کامران، میری زندگی ہے، میری زندگی کا مقصد ہے، مرکز ہے۔ میں جو کچھ بھی محنت کر رہا ہوں اپنے اسی فرزند کے لیے۔ ارشد! بہتان تراشی اللہ کو پسند نہیں۔ اگر تم اس کی قدر نہیں کرتے نہ کرو مگر اس طرح ناقدری اچھی نہیں۔''

وقت گزرتا گیا۔ امتحان شروع ہو چکے تھے۔ اس کا سینٹر شہر سے بیس کلومیٹر دور دوسرے

شہر میں تھا۔ روزانہ بس سے آنا جانا ہوتا۔ ایک رات وہ اگلے پرچے کی تیاری کر رہا تھا۔ پاپا نے بڑی شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا، پیشانی چومی اور پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ اس نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو چند لمحے کے لیے کتاب بند کر دی اور بغور انھیں دیکھنے لگا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطروں کو ٹپکنے نہ دیا۔ وہ تھرتھرا کر آنکھوں کے گروہی تھم گئے تھے۔

''پاپا...... آپ آبدیدہ ہیں؟ کیوں۔''

''نہیں بیٹے...... یہ آنسو نہیں، یہ تو خوشیوں کے موتی ہیں جو تمھاری کارکردگی پر نچھاور ہونے کو بے چین ہیں۔'' تھرتھراتے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ بیٹے کامران! میں نے تمھارا یہ نام اسی لیے رکھا ہے کہ ہمیشہ کامرانی تمھارا مقدر ہو۔ میرے چندا...... میں بڑی مشقت سے تجھے پڑھا رہا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ ایک دن تم علم وادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکو۔ عظیم الشان بنو اور لوگوں کے کام آؤ، حکمراں بن کر نہیں خدمت گار بن کر۔ میری خواہش ہے کہ وہ دن آئے جب میرے اس فرماں بردار بیٹے کو کسی بڑے اعزاز سے نوازا جائے اور تمھارے گلے میں ملک کی بڑی شخصیت طلائی تمغہ پہنائے اور میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھوں۔ یہ میرا خواب ہے۔ یہ خواب پورا ہوگا یا نہیں، اللہ کو معلوم ہے لیکن کوشش کرتے رہنا۔''

اب ان کی آواز سسکیوں میں بدل چکی تھی۔ وہ کمزور ہو گئے تھے۔ ملازمت چھوٹنے کا انھیں بہت صدمہ تھا کیوں کہ حاسد رفیقوں کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ وہ اپنے والد کے سینے سے لپٹ گیا۔

''پاپا...... آپ فکر نہ کریں۔ ایک دن آپ کا یہ خواب میں حقیقت کر کے دکھاؤں گا اور آپ بھی دیکھیں گے۔''

والد کی شفیق نظروں میں محبت کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ انھوں نے فرطِ مسرت سے بیٹے کی پیشانی چوم لی۔

امتحان شروع ہو چکے تھے۔ کامران کے والد نے اس کے چند کلاس فیلو کے ہمراہ آنے جانے کی اجازت دے دی تا کہ تنہا سفر نہ کرنا پڑے۔ آخری پرچہ ختم ہونے کے بعد کافی بھیڑ تھی۔

تمام بسیں بھری ہوئی تھیں۔ گھر لوٹنے والی آخری بس میں بھی تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ شام بھی ہوچکی تھی۔ کامران اور اس کے ساتھی ٹرین سے واپس ہوئے جو رات کے آٹھ بجے سہسرام کو جاتی ہے۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور اسٹیشن دور تھا۔ سب نے رکشہ لینے کا ارادہ کیا۔ کامران خاموش تھا کیوں کہ اس کے پاس صرف ٹرین کا کرایہ تھا۔

''کیا خیال ہے کامران! رکشہ سے چلتے ہیں ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔'' محسن، آلوک اور امیش سبھی ایک ساتھ بولے۔

''تم چلو میں چند ضروری دوائیں والد صاحب کے لیے لے لوں۔ آج کل وہ بیمار رہتے ہیں۔ کمزور بھی ہو گئے ہیں۔ سہسرام میں یہ دوائیں بھی نہیں ملتیں۔ اس نے بہانہ تلاش کیا لیکن امیش کی سمجھ میں بات آگئی کہ کامران کیوں رکشہ سے جانے کو انکار کر رہا ہے۔ امیش نے کہا۔'' بھئی رکشہ کا مشورہ میں نے دیا ہے اس لیے دوا لے کر ہم سب رکشہ سے اسٹیشن چلیں گے اور کرایہ میں ادا کروں گا۔''

والد کی دوا خرید کر کامران اور اس کے ساتھی پیدل چلتے ہوئے رکشہ اسٹینڈ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اتنے میں خالی جاتی ایک رکشہ والے کو آواز دی۔ کرایہ طے کیے بغیر سبھی ساتھی رکشہ پر سوار ہو گئے۔ شہر کی بجلی گل تھی۔ رکشہ والا دھیمی رفتار سے چلا رہا تھا۔

''رکشے والے، ذرا تیز چلو بھئی...... ورنہ ہماری ٹرین چھوٹ جائے گی۔'' آلوک نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ارے یار...... کیوں انھیں مجبور کر رہے ہو۔ اس عمر میں بے چارے رکشہ کھینچ رہے ہیں، نہ جانے کیا مجبوری ہے۔ کم سے کم ان کی عمر کا تو خیال کرو۔ چچا میاں! اس کی بات کا برا نہ مانیے گا۔ دراصل ہم لوگوں کو گھر پہنچنے میں دیر ہوگئی ہے۔ اس لیے یہ پریشان ہے۔'' کامران نے آلوک کو سمجھایا اور اس رکشہ والے سے معذرت چاہی۔ اسٹیشن پر پہنچتے ہی کامران رکشہ سے اتر کر تیزی سے ٹکٹ کاؤنٹر پہنچا اور ٹکٹ لے کر واپس آیا۔ ادھر بقیہ بچے بھی اتر چکے تھے۔ امیش نے رکشہ کا کرایہ ادا کر دیا تھا۔ اب سبھی لڑکے پلیٹ فارم پر آ گئے تھے۔

امتحان ختم ہو چکے تھے۔ اب اسے اپنے رزلٹ کا انتظار تھا۔ اللہ کی رحمت سے رزلٹ شائع ہوا۔ اپنے اسکول کا واحد مسلم طالب علم تھا جسے 90% فیصد نمبر حاصل ہوئے اور فرسٹ ڈویزن سے کامیاب رہا۔ مقامی اخباروں میں بھی اس کی ستائش ہوئی۔

آج وہ آگے کی پڑھائی کرنے کے لیے شہر سے باہر ملک کی مشہور یونیورسٹی میں داخلہ لینے جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر اس کے احباب، عزیز، خیر خواہ موجود تھے۔ کامران اپنے تمام ملنے والوں سے مصافحہ کر رہا تھا۔ اتنے میں آواز آئی۔ پروشوتم ایکسپریس چند ہی لمحوں میں پلیٹ فارم نمبر ۲ پر آرہی ہے۔ سبھی مسافر تیار ہو گئے۔ کامران نے ذہنی طور پر خود کو تیار کرلیا۔ آج وہ پہلی بار اپنے والد سے جدا ہونے والا تھا۔ وہ والد جنھوں نے بچپن سے آج تک اپنے سینے سے لگائے رکھا وہ بھی دل ہی دل میں غم گین تھے لیکن اپنے تاثرات بیٹے پر ظاہر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آچکی تھی۔ سبھی مسافر اپنی جگہ تلاش کرنے میں محو تھے لیکن ندیم اشرف کے ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا۔ انھوں نے کامران کو سینے میں بھینچ لیا۔ زار و قطار رونے لگے۔ ''میرے لعل کس دل سے جدا کر رہا ہوں وہ میں جانتا ہوں اور میرا خدا۔ میرے بیٹے تمھارے مستقبل کے خاطر تمھارا یہ کمزور باپ ہر غم کو جھیل لے گا۔ تمھاری جدائی میرے لیے اذیت ناک ہے۔'' لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ بے اختیار بیٹے کو چومنے لگے۔ گارڈ نے وسل دی۔

''چچا گاڑی چھوٹنے والی ہے۔'' امیش نے سمجھایا۔

''میرا بیٹا بھی تو مجھ سے چھوٹ رہا ہے۔'' کامران کے والد نے درد بھرے لہجے میں جواب دیا اور بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

''جاؤ بیٹا! اللہ کے حوالے کیا۔ خوب دل لگا کر پڑھنا۔ میری یہی آرزو ہے۔ اللہ تمھیں کامیاب کرے فی امان اللہ......!''

گاڑی رفتہ رفتہ سرکنے لگی۔ کامران ہاتھ ہلا کر والد کو الوداع کہہ رہا تھا۔ والد بھی جواب میں ہاتھ ہلاتے رہے جب تک کہ ٹرین نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

آج کامران اشرف کے والد کا خواب پورا ہو چکا تھا لیکن...... وہ اسی خیالوں میں گم تھا

کہ ایک بار پھر ہال میں موجود لوگوں کو اناؤنسر کی آواز نے چونکا دیا اور وہ ماضی کے گلیاروں سے باہر آ گیا، لوگ اس کی زبان سے چند الفاظ سننا چاہتے تھے۔ اناؤنسر نے تمہیدی جملوں کے بعد کامران کو اپنے احساسات بیان کرنے کی دعوت دی۔ بھیگی پلکوں کو خشک کرتے ہوئے وہ سامعین سے مخاطب ہوا۔ ''قابل احترام مہمان خصوصی، اراکین مجلس انتظامیہ اور معزز سامعین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

''آج کا دن میری زندگی کا سب سے اہم دن ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جو میرا اثاثہ بن چکے ہیں۔ جس دن میں طلائی تمغہ اپنے والد صاحب کے گلے میں پہناؤں گا وہ میرے لیے تاریخی ہوگا کیونکہ اس تمغہ کے اصل حق دار میرے محترم والد صاحب ہیں جن کی با شفقت جدوجہد نے اس منزل تک پہنچنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔''

اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ کہتا، اس کی آنکھوں میں شبنمی قطرے چھلک آئے۔ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے وہ پھر گویا ہوا۔

''عزیز ساتھیو! وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتا جب بارہویں درجہ کے فائنل امتحان کے بعد میں اور میرے تین ساتھی ایک رکشہ پر سوار ہوکر اسٹیشن تک آئے تھے۔ وہ رکشہ کھینچنے والا کوئی اور نہیں میرے والد تھے۔ دراصل وہ دوسرے شہر میں ساری رات رکشہ چلا کر گھر کے گزارے اور میری تعلیم کو جاری رکھ سکے۔ آج وہ شفیق باپ ہزاروں کلومیٹر دور بستر علالت پر بھی میرے اس رزلٹ اور اپنے اس خواب کی تعبیر کے لیے منتظر ہیں جو کبھی ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ اسٹیشن پر مجھے رخصت کرتے وقت بھی کہا تھا۔ بیٹا! میری ایک ہی آرزو ہے۔''

اپنے آنسوؤں کو رومال سے خشک کرتے ہوئے وہ رواں ہوا۔

''عزیزو! غور کریں، اس وسیع ہال میں ہزاروں کی تعداد ہے لیکن یہ کامران اشرف خود کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔ یہ تمام اعزاز، آپ کی الفت اور میرے والدِ محترم کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ وہ اکثر کہتے ہیں:

ع
نصیب ہو تجھے اتنا عروج دنیا میں
کہ آسماں تیری رفعتوں پہ ناز کرے

اللہ رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ان کا خواب حقیقت بنا۔

''معزز سامعین دل گھبرا رہا ہے۔ میں کچھ کہنے کی حالت میں نہیں ہوں۔ ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ جتنا جلد ہو سکے یہ خوشیاں، یہ تمغہ، یہ اعزاز اپنے والد کے ہاتھوں میں رکھ دوں۔ ان ہاتھوں میں جو رکشہ کھینچتے کھینچتے سخت ہو گئے ہیں۔ پھر بھی ایک بات نہ صرف آپ کو بلکہ تمام والدین کو بتا تا چلوں کہ آج ہمیں تعلیم کی بہت ضرورت ہے۔ اس میدان میں ہمیں جنگی سطح پر کام کرنا ہوگا۔ والدین سے میری خاص گزارش ہے کہ ہر قیمت پر وہ اپنے بچوں کو تعلیم یافتہ بنائیں''

ابھی وہ اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ اس کے سامنے ایک سفید رقعہ پیش کیا گیا۔ رقعہ دیکھ کر اس کے ماتھے پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

''ساتھیو! ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ میرے والدِ محترم کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے۔ لہٰذا مجھے جلد از جلد ان کے پاس پہنچنا ہوگا۔ اللہ حافظ۔''

تمام سامعین نے کھڑے ہو کر تالیوں کی آواز سے اس کا استقبال کیا اور وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

گاڑی جیسے ہی اسٹیشن پر رکی وہ تیزی سے پلیٹ فارم پر اترا۔ اس کے ہم جماعت بھی اسے لینے آئے تھے۔ گھر کے دروازے پر لوگوں کی جمع بھیڑ دیکھ کر اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ بھاگ کر والد کے کمرے میں پہنچا۔

''پاپا...... پاپا...... دیکھو میں آ گیا۔ تمھارا کامران اشرف آ گیا۔ پاپا...... یہ طلائی تمغہ تمھارے خوابوں کی تعبیر۔''

اس نے اپنے والد کے ہاتھ پر تمغہ رکھ دیا۔

''پاپا اسے چھو لو۔ اسے محسوس کرو۔ پاپا! خاموش کیوں ہو...... بولو نا...... تمھارا کامی تمھیں آواز دے رہا ہے۔ انکل! میرے پاپا بولتے کیوں نہیں؟''

گھر کے لوگوں نے اسے دلاسا دیا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے سمجھایا۔ وہ پھر رونے لگا۔

''پاپا...... میرے اچھے پاپا...... مجھے معاف کردو۔ میں نے انجانے میں تمھارے رکشہ پر سواری کی تھی۔ پاپا...... تم نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔ تم نے کہا تھا۔ اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے رکشہ بھی چلانا پڑا تو وہ بھی چلاؤں گا لیکن میں......؟ اس کا گلا رندھ گیا۔

اس کے والد اس دنیا میں نہیں رہے لیکن کامران کو یہ اطمینان ہے کہ اس نے والد کے خواب کو پورا کردیا ہے۔ آج وہ ایک ضلع کا آفیسر ہے مگر جب بھی اس طلائی تمغے پر نظر پڑتی ہے تو رکشہ پر سواری کا منظر اسے زخمی کردیتا ہے......!!

☆☆☆

تمناؤں کا خون

''میں کب سے تمھیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ سارا ایریا تلاش کرلیا اور تم یہاں لان میں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟'' صفیہ نے خفگی سے آشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ آشی اس وقت ایک رسالے کا مطالعہ کر رہی تھی۔

''اچھا تو یہ بات ہے، آپ محترمہ یہاں تنہائی میں بیٹھ کر افسانے پڑھ رہی ہیں۔ لاؤ مجھے دکھاؤ کون سا افسانہ ہے۔؟''

''نہیں...... میں تمھیں ابھی نہیں دے رہی پہلے مجھے پڑھنے دو بعد میں پڑھ لینا۔''

''ایسا کیا ہے اس افسانہ میں کہ تو دیمک کی طرح لگ گئی ہے۔''

''تجھے کیا پتہ کہ افسانہ کیا ہوتا ہے۔؟''

''مجھے سب پتہ ہے...... تو رسالہ افسانے کے لیے نہیں بلکہ راشد نوری کے افسانے کے لیے خریدتی ہے۔ آخر یار ایسا کیا ہے اس کے افسانے میں جو تو اس قدر اس کی دیوانی ہے......؟'' صفیہ نے اسے چھیڑا۔

''ایک بار اگر تو پڑھ لے گی، تو تیرا بھی وہی حال ہوگا جو تو مجھے کہہ رہی ہے......'' آشی نے شوخی سے جواب دیا...... اور اٹھ کر دونوں اپنے کلاس میں چلی گئیں۔ اگلے دن جب صفیہ کالج آئی تو اس کے چہرے پر خاص قسم کی چمک تھی۔ خالی پیریڈ میں وہ آصف کے ساتھ لان میں بیٹھی راشد نوری کے افسانے پر تبادلۂ خیال کر رہی تھی۔

''بولو صفیہ بیگم! کیسا لگا افسانہ......؟''

''میں نے سبھی افسانے پڑھ ڈالے یار بہت بہترین افسانہ لکھا ہے۔ میں نے تو تمھارے دیے ہوئے سبھی افسانوں کا مطالعہ کیا۔ لیکن ایک بات تم نے غور کی...... '' صفیہ نے سوالیہ نظروں سے آشی کو دیکھا۔

''وہ کیا......؟'' آشی نے جواب طلب نگاہ ڈالی۔

''اس کے افسانے تمھاری زندگی میں ہونے والے واقعات سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کہ کسی نے تمھارے ماضی کے حالات راشد نوری کو حرف بہ حرف سنائے ہیں۔''

''تم نے بھی بات کہاں سے کہاں پہنچادی۔'' راشد نوری سے ارشد راہی کا کیا مقابلہ۔ تم نے بھی اس کا نام لے کر افسانے کا مزہ خراب کردیا۔''

''تم مانو یا نہ مانو لیکن اس کے افسانے میں جو درد ہوتا ہے، وہ حقیقت سے قریب تر لگتا ہے۔'' صوفیہ نے مزید تبصرہ کیا۔

''کیوں نہیں...... سچ تو ہے افسانے بھی زندگی سے کہیں نہ کہیں میل کھاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ سبھی افسانے محض خیالات کی پرواز ہی ہوں۔'' آشی نے ٹکڑا لگایا۔

''تم نے ٹھیک کہا۔ کبھی کبھی حقیقت، افسانہ بن کر ہمارے دلوں کو جھنجھوڑنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔'' صفیہ سنجیدگی سے بتا رہی تھی۔

''میری اچھی سہیلی! اب سمجھ میں آئی بات کہ میں راشد نوری کے افسانے کیوں پسند کرتی ہوں؟ وہ جو بھی لکھتا ہے وہ میرے دل کو چھو جاتا ہے۔ اس کے افسانے کی خوبی یہ ہے کہ جو بھی پڑھے گا اسے یہ محسوس ہوگا جیسے وہ افسانہ اس کی زندگی کا ہی عکس ہے۔ راشد کی اسی فنکاری سے متاثر ہو کر میں تو اس کی فین ہوگئی ہوں۔''

''تو یہ بات ہے......؟ محترمہ اسی وجہ سے تنہائی میں بیٹھ کر چپکے چپکے راشد نوری کو پڑھتی رہتی ہیں...... میری مانو تو ان افسانوں کے جنگل میں بھٹکنا چھوڑ دو۔ یہ افسانہ نگار ہوتے کچھ اور ہیں، دکھاتے کچھ اور۔ ان کی تصویر دیکھ کر لوگ ہمیشہ دھوکا کھاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک دن تجھے بھی پچھتاوا ہو۔'' صفیہ نے اپنی بات مکمل کی۔

''صفیہ! تم بھی نا...... ضرورت سے زیادہ ہی محتاط رہنے کی بات کرتی ہو۔ میں تو زندگی

کو زندگی کی طرح جینے کی عادی ہوں۔ کل کے غم میں آج کی خوشیاں کیوں ضائع کروں۔'' آشی نے صفیہ کو دلاسا دیا۔

''ایک بات تو میں ضرور کہوں گی۔ تم ہنستی ہو، چلبلے پن کا اظہار کرتی ہو لیکن یہ سب بھی ایک فریب ہی تو ہے۔ تمھیں احساس نہیں ہوتا اپنی غلطیوں کا؟ تم نے کس بے رخی سے ارشد راہی کے پیغام کو ٹھکرایا تھا۔''

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ماضی کے پردے ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔

ارشد راہی اور آشی ایک ہی کالج کے طالب علم تھے۔ ارشد کمپیوٹر سافٹ ویئر کی انجینئرنگ کے فائنل ایئر میں تھا اور آشی بی۔ اے کے پہلے سال میں ایڈمیشن فارم بھرنے کے وقت دونوں کی ملاقات اتفاقاً ہوئی تھی۔ لمبی لمبی قطاریں فارم جمع کرنے کے لیے لگی تھیں۔ اسی قطار میں ایک نازک سی لڑکی پیازی رنگ کے لباس میں دور کھڑی بھیڑ کا جائزہ لے رہی تھی۔ ارشد راہی کھڑکی تک پہنچ چکا تھا۔ ارشد کو کنارے کھڑی لڑکی بے بسی دیکھی نہ گئی۔ اس نے آواز دی۔ ''ہیلو......!'' لڑکی نے آواز کی طرف رخ کیا......''جی ہاں...... آپ ہی سے کہہ رہا ہوں۔ آپ اپنا فارم مجھے دیں میں جمع کر دیتا ہوں۔'' ارشد نے ہمدردی دکھائی۔ اور اس نے وقت ضائع کیے بغیر ہاتھ بڑھا کر اپنا فارم ارشد کو دے دیا۔

''یہ لیجیے آپ کی رسید......'' ارشد نے رسید دیتے ہوئے کہا۔

''بہت بہت شکریہ......''

''اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ میں نے آپ کو بالکل مایوس پا کر اپنا فرض سمجھا کہ مدد کر دوں بس اللہ کو میرے ذریعہ آپ کا کام کرانا تھا وہ ہو گیا۔ شکریہ تو اللہ کا ادا کریں۔''

''آپ باتیں بڑی اچھی کرتے ہیں۔'' آشی نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ کئی دنوں تک آشی کی نگاہ کالج کی بھیڑ میں اسے ڈھونڈتی رہی لیکن وہ نظر نہیں آیا۔

خالی پیریڈ میں اس نے کامن روم کا رخ کیا۔ وہ اپنی سہیلی صفیہ سے ملاقات کی غرض سے چلی کیوں کہ اس کا بھی یہ پیریڈ خالی ہوتا تھا۔ کامن روم کے دروازے پر پہنچتے ہی صفیہ دکھائی

دی جو اسی لڑے سے باتیں کر رہی تھی جس نے ایڈمیشن فارم جمع کرایا تھا۔ نزدیک پہنچتے ہی صفیہ نے تعارف کرایا۔

''ان سے ملو، یہ ہیں ارشد راہی، سافٹ ویئر انجینیر نگ کے فائنل میں ہیں اور یہ ہیں میری پیاری سی، نازک سی، چلبلی سہیلی آشی۔''

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ حالانکہ ہم پہلے مل چکے ہیں۔''

''کیا......؟؟ تم دونوں ایک دوسرے سے مل چکے ہو......؟'' صفیہ نے حیرت جتائی۔

''ہاں...... لیکن وہ محض ایک اتفاق تھا اور ویسے بھی ہم اب سے پہلے ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ باضابطہ تعارف تو آپ نے ہی کرایا مس صفیہ۔'' اس نے ایک نظر آشی پر ڈالتے ہوئے کہا۔ آشی شرما کر رہ گئی۔ تینوں کالج کے کینٹین میں چائے پینے چلے گئے۔ ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا رہا اور ایک دن وہ بھی آیا جب دلوں کے اندر جنم لینے والے جذبوں کو زبان مل گئی۔ کالج کی محدود فیلوشپ محدود نزدیکیوں میں بدل چکی تھی۔

ارشد راہی کی وجاہت، شرافت، ذہانت اور کردار نے آشی پر جادو سا کر دیا تھا۔ خیالوں کی دنیا میں وہ اس کا شہزادہ تھا۔ ایک دن آشی نے ارشد راہی کو اپنے والد سے ملانے کی بات کہی...... ارشد تھوڑا پریشان ہوا کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایک متوسط خاندان کا چشم و چراغ ہے اور آشی...... آشی کو اللہ نے ہر طرح سے نوازا تھا۔ ارشد کسی طرح اس کے مقابل نہیں تھا۔

''کیا بات ہے ارشد! تم سنجیدہ کیوں ہو گئے......؟''

''آشی! تم جو سمجھ رہی ہو وہ میں نہیں ہوں۔ میں تمھارے گھر جا کر کیا کروں گا۔ ہم لوگ یہاں پڑھنے آئے ہیں، تعلیم مکمل کر کے اپنے اپنے راستے لوٹ جانا ہی ہمارا مقصد ہے۔''

''عجیب آدمی ہو...... ایک لڑکی تمھیں چاہ رہی......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ نگاہ زمین پر کچھ تلاش کرنے میں مصروف ہو گئی۔ رخسار پر قوس وقزح کے رنگ نمودار ہوئے اور وہ شرمائی لجائی سی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اگلے دن دروازے پر دستک ہوئی۔ ''کون ہے...... ابھی آیا......'' کہتے ہوئے ارشد نے جیسے ہی دروازہ کھولا سامنے آشی پھولوں کا گلدستہ لیے کھڑی تھی۔

''ت......ت......تم......یہاں......'' ارشد کو حیرت ہوئی۔ ''تمھیں میرے گھر کا پتہ کس نے دیا۔''

''جب دل میں کسی کے لیے خاص مقام ہو تو اُس کی جائے رہائش کا پتہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔ خیر یہ لو......'' اس نے خوشبودار تازہ پھولوں کا گلدستہ اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔

''Happy birth day''

ارشد کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ''تمھیں میرا برتھ ڈے کیسے معلوم ہوا؟'' کہتے ہوئے اس نے گلدستہ ہاتھوں سے لے لیا۔ اور آشی کی شربتی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

''دروازے پر ہی کھڑا رکھو گے یا اندر آنے کو بھی کہو گے۔'' بے تکلفی سے آشی نے کہا۔ دونوں ہنستے ہوئے کمرے میں پہنچے۔ ارشد نے اپنی والدہ سے آشی کا تعارف کرایا۔ والدہ نے بڑی شفقت سے آشی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دیں۔ لیکن ساتھ ہی نصیحت بھی کی کہ شریف گھرانوں کی لڑکیاں اس طرح تنہا گھر سے باہر نہیں نکلا کرتیں۔

ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ایک دن اس مقام پر پہنچ گیا کہ آشی اور ارشد ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کی بھی سوچنے لگے۔ ایک دن آشی نے کالج میں ارشد سے صاف صاف کہہ دیا...... ''ارشد...... اب اور نہیں...... میں تمھارے بغیر نہیں جی سکتی۔ میری نظر میں سوائے تمھارے کسی اور کا تصور نہیں۔ میں نے دل ہی دل میں تمھیں چاہا ہے اور شادی کروں گی تو تمھیں سے......''

یہ سنتے ہی ارشد ٹھٹھک گیا...... ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو...... شادی اور وہ بھی مجھ سے......؟''

''ہاں...... تم سے اور میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ میں نے اپنے والدین سے تمھارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ انھیں بھی میرے فیصلے سے انکار نہیں ہے۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں کل ہی ہمارے والدین تمھارے گھر اس سلسلے میں پہنچنے والے ہیں اور تمھاری والدہ سے بات کریں گے۔ دیکھو انکار مت کرنا ورنہ میں......''

اسی درمیان ارشد نے اسے سمجھایا ''ٹھیک ہے یہ کام ہمارا نہیں گھر کے بڑوں کا ہے اس

معاملے میں جو فیصلہ بڑے کرتے ہیں وہ بہتر کرتے ہیں پھر اللہ سے بڑا و برتر کوئی نہیں اس کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں۔ وہ جو چاہتا ہے وہی بہتر ہوتا ہے۔ اور ایک بات تم بھی سن لو میں اور میرا خاندان دولت وثروت سے دور ہے۔ علم کی دولت ہے اور قلم کی دولت کے سہارے ہی ہم اپنی زندگی گزارتے ہیں اور اللہ کے شاکر ہیں۔ تمھاری طرح دولت کی فراوانی ہمارے یہاں نہیں اس بات کا اچھی طرح خیال رکھنا۔"

آشی کے والدین آئے۔ وہ ارشد کی ذہانت بھری باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کی والدہ بھی جہاں دیدہ شخصیت تھیں رشتے کی بات طے ہوگئی۔ دونوں خاندانوں میں یہ خوش خبری دے دی گئی۔ کالج میں چاروں طرف سے آشی وارشد کو مبارکباد ملنے لگی۔ بہت نزدیکی فیلوز نے تو آشی کو چھیڑنا شروع کردیا۔

"واہ میڈم! چپکے چپکے زبردست ہاتھ مارا" کوئی کہتا "ہم تو اس نوجوان سے بات کرنے کو ترستے رہے اور تم نے تو کالج کے سب سے Intellegent لڑکے پر اپنا جادو چلا دیا۔" اس طرح کی باتیں آشی کے کانوں میں رس گھولتی رہیں اور وہ مستقبل کے خوابوں میں جھولے جھولتی رہی۔

ہاسپٹل میں اسٹوڈینٹس کا ہجوم تھا۔ ارشد راہی ایک کار ایکسیڈنٹ میں زخمی ہونے کے بعد اسپتال میں داخل تھا۔ جہاں وہ زندگی اور موت سے جنگ لڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر کی انتھک کوشش جاری تھی۔ اب تک اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ باہر کالج کے ساتھیوں کا جمِ غفیر ایک جھلک پانے کو بے تاب نظر آرہا تھا۔ والدین کا روتے روتے برا حال تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر نے کہا "ماں جی! آپ مایوس نہ ہوں۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں آپ کے بیٹے کو بچانے کی بھگوان پر بھروسہ رکھیں۔"

"میں کیا کروں بیٹا! سوائے اس کے اور بھروسے کے لائق کون ہے.....؟ میری زندگی کا واحد سہارا تو وہی ایک ہے آگے جو اوپر والے کی مرضی، میں تو صبر ہی کر سکتی ہوں۔" تسلی دے کر ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں چلا گیا۔ چار گھنٹے کی مشقت کے بعد زندگی نے موت کو شکست دے ہی دی لیکن ایک پہچان چھوڑ گئی۔ بایاں پیر کچل جانے کے سبب ناکارہ ہو چکا تھا اور مزید زہر جسم میں پھیلنے لگا اس لیے ڈاکٹر کو مجبوراً ٹانگ کے نچلے حصے کو کاٹنا پڑا۔

لوگ اسپتال میں آتے رہے اور عیادت کر کے چلے جاتے۔صوفیہ اور آشی بھی کئی بار آئیں۔صوفیہ معمول کے مطابق اخلاقی فرض نبھاتی رہی ،لیکن آشی میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں تھی۔اسپتال وہ اکثر آتی لیکن اس طرح جیسے وہ ارشد راہی سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔مغموم چہرہ، فکر مند آنکھیں، چہرے پر شگفتگی کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔اس کی اس خاموشی اور طرزِ عمل سے ارشد اندر ہی اندر پریشان ہو رہا تھا۔اسے احساس تھا کہ اتنے بڑے ایکسیڈنٹ نے اس کے دل پر گہرا اثر ڈالا ہے۔وہ شخص جو اس کی زندگی کا ساتھی بننے والا ہے وہ بستر پر ہے۔اس کا فکر مند ہونا فطری بات ہے۔یہی سوچتے سوچتے وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

ارشد بستر پر دراز تازہ اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ماحول کو معطر کر گیا۔ارشد کی نگاہ دروازے پر پڑی تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔بڑی مشکل سے وہ پیٹھ کو ٹیک سکا۔"آؤ...... آؤ...... آشی...... کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔"ایک مختصر سا جواب آشی نے دیا۔

"کیا بات ہے تم کچھ افسردہ نظر آتی ہو؟"۔

"ہاں ارشد! میں کئی روز سے ایک بوجھ سینے میں لیے گھوم رہی ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

"کیسا بوجھ......؟"ارشد نے سوال کیا۔

"تمھارے ایکسیڈنٹ کے بعد میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں میرا کیا ہوگا۔والدین بھی اس سلسلے میں سنجیدہ ہیں۔"

"کیوں...... کیا تم کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے آشی......؟"

"اعتماد ہے ارشد، لیکن......"

"لیکن کیا......؟"ارشد نے بات کاٹی۔

"حقیقت کے اس دور میں محض خوابوں کے سہارے جینا بیوقوفی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔تم ہی سوچو جو شخص خود اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا وہ اپنی شریکِ حیات کو کیا خوشیاں دے سکتا ہے اسے تو خود سہارے کی ضرورت ہے۔ویسے بھی تمھارے پاس زندگی میں جینے کے لیے سوائے

تعلیمی سند کے اور کیا ہے۔ کاغذ کے ان بے جان ٹکڑوں سے تم کسی کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ اس کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے جو تمھارے پاس ابھی نہیں۔ اس لیے آج میں تمھیں بتانے آئی ہوں کہ تم مجھے بھول جاؤ۔ اپنے دل سے میرا خیال ہٹادو۔ ایک لنگڑے اپاہج کے ساتھ زندگی گزارنا میرے لیے مشکل ہے...... حقیقت یہی ہے اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔'' اور ارشد اس کا منھ دیکھتا رہ گیا تھا۔

''ارے میڈم کہاں کھو گئیں۔ کیا راشد نوری کے خیالوں میں گم ہو رہی ہیں؟'' صوفیہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ آشی اچانک چونک گئی۔

''کیا کروں...... راشد نوری کے تازہ افسانہ نے تو مجھے اس قدر پاگل کر دیا ہے کہ میں نے سوچا ہے کہ ان سے ملاقات کروں۔ میں نے جب بھی ان کے افسانے پڑھے اس کی تعریف تحریری طور پر کی۔ بڑی اچھی تحریر لکھتے ہیں، ان کے خطوط ایسے ہوتے ہیں جیسے صفحات پر موتیوں کو بکھیر دیا ہو۔ اور ایک ایک جملہ اپنے اندر احساس کا وہ سمندر ہوتا ہے جس میں غوطہ زن ہونے کے بعد نکلنے کی خواہش نہیں ہوتی۔''

''کیا بات ہے...... کہیں تیرے دل میں راشد نوری کے لیے نرم گوشہ تو نہیں بن گیا جسے ایک خاص جذبے کا نام دیا جائے۔؟''

صوفیہ نے چٹکی لی۔

''بات وہ نہیں لیکن اتنا سچ ہے کہ میں ان کے جذبے سے بہت متاثر ہوں اور ملنا چاہتی ہوں۔''

''صرف ملنا چاہتی ہو یا جڑنا بھی چاہتی ہو۔؟''

''پہلے ملاقات تو ہو...... ویسے میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے بخوشی میری عرضی قبول کر لی۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ایک دن عقیدت کے پھول ان کے قدموں میں ضرور ڈالوں گی۔ صرف انتظار ہے تو ان کے اپوائنٹ منٹ کا۔''

''یعنی تو راشد نوری سے ملنے کا پختہ ارادہ کر چکی ہے۔؟'' صفیہ نے کہا۔

''صرف ملنے کا ہی نہیں بلکہ......؟'' وہ کہتے کہتے شرما گئی۔ ''بیسٹ آف لک'' کہہ کر صفیہ رخصت ہو گئی۔

ایک شاندار کوٹھی کے سامنے آٹو آکر رکی۔ آشی نے آٹو رکشہ والے سے کہا ''یہ تم مجھے کہاں لے آئے۔؟''

''میڈم آپ نے جو پتہ بتایا تھا وہ جگہ یہی ہے اور کوٹھی بھی اور اس شہر میں راشد نوری کو کون نہیں جانتا۔''

آشی نے رکشہ سے قدم باہر نکالا۔ ایک شاندار عمارت اس کے سامنے تھی۔ ایک بڑے آہنی گیٹ کی طرف وہ بڑھی تو نیم پلیٹ دیکھ کر اطمینان ہوا۔ سیکوریٹی کے ایک اہلکار نے نام و پتہ پوچھا اس کے بعد اندر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ ہلکے قدم سے خراماں خراماں چلتی ہوئی دروازے پر پہنچی۔ کال بیل پر کانپتی انگلی رکھ دی۔ دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ ہاتھوں میں خوبصورت پھولوں کا بکے لیے وہ تیز دھڑکن کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ یکا یک ایک آواز نے سکوت توڑا۔ ''اندر آجاؤ۔''

''لیکن یہاں تو گہری تاریکی ہے۔'' آشی کی زبان سے نکلا۔

''گھبراؤ نہیں...... تاریکی کے بعد روشنی کا ظہور ضرور ہوتا ہے۔''

وہ قدم سنبھال کر چل رہی تھی آج اس کے خواب حقیقت بننے جا رہے تھے۔ وہ افسانہ نگار جس کے صرف افسانہ کو ہی وہ پسند نہیں کرتی بلکہ اس پر فدا ہو چکی تھی، اس کے دل میں اپنی جگہ بنا چکا خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے ہوگا اور وہ اپنے ہاتھوں سے عقیدت کے یہ پھول اس کے قدموں میں رکھے گی۔

وہ کتنی خوش قسمت ہے کہ راشد نوری جیسے عظیم افسانہ نگار نے اسے مدعو کیا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے وہ رکی، ہلکی روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔ دوبارہ وہی آواز......

''رک کیوں گئیں۔''

''بہت اندھیرا ہے۔''

اچانک پورا ہال روشن ہوگیا۔ سامنے ایک بڑی کرسی پر ایک شخص بیٹھا تھا جس کی شکل دیکھتے ہی آشی چونک گئی...... ''تم......؟؟ ارشد راہی......؟''

''ہاں صحیح فرمایا، ارشد راہی...... خوش آمدید...... معاف کرنا کھڑے ہو کر تمہارا استقبال

نہیں کر سکتا...... لنگڑا ہوں نا۔! دیکھو! آج میرے پاس دولت، نام وشہرت سب کچھ ہے۔ اس میں میری معذوری رکاوٹ نہیں۔ آج اتنی بڑی کوٹھی کا مالک ہوں۔ ایک خوبصورت بیوی اور دو بچوں کا باپ ہوں۔ لیکن شکر گزار ہوں تمھارا کہ تم نے ہی مجھے جینے کی تحریک دی۔ لاؤ اپنے عقیدت کے پھول پیش کرو! ارشد راہی تو اسی دن فوت ہوگیا تھا جس دن تم نے اسے لنگڑا اپاہج کہہ کر اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا تھا اسی خون کے قطرہ سے راشد نوری کا جنم ہوا جو تمھارے سامنے ہے۔'' ارشد راہی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ''آشی! اس روز تم نے مجھے نہیں میری مجبوری کو چوٹ پہنچائی تھی۔''

آشی کے ہاتھ سے پھولوں کا بکے چھوٹ کر گر گیا اور سارے پھول گر کر بکھر گئے۔

☆☆☆

جھوٹا سچ

انتخابی مہم کے دوران نیتا جی کی حمایت میں پورا شہر کھڑا تھا۔ نیتا جی نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کی۔ عوام نے خوش ہوکر ''زندہ باد، نیتا جی امر رہیں، ہمارا لیڈر کیسا ہو نیتا جی جیسا ہو'' کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ تقریر ختم ہو چکی تھی بھیڑ چھٹنے لگی ادھر نیتا جی اپنے حمایتیوں کی دیوار سے گھرے سفید رنگ کی ایمبیسڈر میں جا بیٹھے اور گاڑی دھول کے غبار عوام کے چہرے پر چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ انسانوں کا ہجوم دیکھ کر نیتا جی کو سکون ہوا اور چند دنوں بعد وہ سکون خوشیوں کی سوغات لیے حاضر ہوا جب نیتا جی کثیر اکثریت سے انتخاب جیت گئے۔ علاقے میں خوشیاں منائی گئیں، جسے جو سمجھ میں آیا اپنے طور پر اپنے پیارے نیتا کو مبارکباد دینے پہنچ گیا۔ جمہوریت میں سب سے پیاری کوئی چیز ہے تو وہ ہے ''نیتا'' دورِ وسطیٰ میں شہنشاہ، بادشاہ، سلطان، راجہ اور نوابین عوام کے نورِ نظر ہوتے تھے لیکن آج کل ان کی جگہ جمہوریت نواز نیتاؤں نے لے لی ہے۔ عوام نے جمہوریت کی فصل سے اگے ان نیتاؤں کو اپنے پلکوں پر بٹھا رکھا ہے۔ جہاں ان کے قدم پڑتے ہیں وہاں عوام آنکھیں بچھا دیتے ہیں جمہوریت کا کاروبار اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

دفتر سے لوٹ کر آیا تو بیوی نے فوراً کھانا لگایا کھانے کے بعد آرام کرنے لگا۔ خبریں سننے کے لیے جیسے ہی ٹی وی آن کیا ایک سنسنی خیز خبر نشر ہوئی۔ ایوان میں دو عوامی نمائندوں کے درمیان مکہ بازی اور غیر اخلاقی جملوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ اسکرین پر یہ مناظر دیکھ کر میری بیوی حیرت زدہ تھی۔ ''اجی! دیکھ رہے ہیں۔ یہ ہمارے منتخب نمائندہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ ملک کے حکمراں بننے کے خواہشمند ہیں؟'' یہ منظر دیکھ کر وہ ہنسنے لگی اور میرا مذاق اڑاتے ہوئے بولی ''آپ

بھی تو ہر وقت نیتا جی کی چاکری میں لگے رہتے ہیں۔ آپ لوگ ایسے ہی لوگوں کو نمائندہ بنانے کے لیے جگہ جگہ عوامی جلسے اور تقاریر کرتے ہیں؟ یہ کیسی عوامی بیداری ہے۔ یہ تو نہایت بدتمیز لوگ معلوم ہوتے ہیں زبان اتنی گندی اور طرز عمل بے ہنگم یہ کیا ملک و قوم کی رہنمائی کریں گے؟''
میری بیوی تبصرہ کر رہی تھی اور میں شرمندہ ہو رہا تھا کیونکہ میں بھی ایک سیاسی جماعت کے ایک بڑے رہنما کا نورنظر تھا اور ہر وقت سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا، نیند نہیں آرہی تھی تو بیوی سے کہا میرے سر کی مالش کر دو اس کی نازک انگلیاں میرے بالوں سے کھیلنے لگیں اور مجھے گہرا سکون محسوس ہوا میری آنکھیں بند ہوتی گئیں۔

چاروں جانب اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا۔ میں اس تاریکی سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کہیں سے کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی نے مجھے گہری کھائی میں پھینک دیا ہے۔ میں نے اپنا دم گھٹتا محسوس کیا تو پوری طاقت سے چلانے لگا مگر میری آواز اس اندھیری گھاٹی میں دم توڑ گئی۔ کسی طرح وہاں سے نکلنے کی سعی کرنے لگا قدم اٹھانا چاہا تو محسوس ہوا کہ کسی غیبی طاقت نے میرے پیر زمین میں جما دیے ہیں۔ میں اب چیخنے لگا ''مجھے یہاں سے نکالو کس نے مجھے یہاں قید کر دیا لیکن میری آواز ان اونچی دیواروں سے ٹکرا کر بازگشت کرنے لگی۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی مگر بے سود۔ یکا یک مجھے احساس ہوا کہ میرے پیر ہلکے ہو گئے ہیں میرا تمام جسم خزاں رسیدہ پتہ کی طرح ہوا میں اڑنے لگا میں گھوڑے پر سوار ہوں میرے دونوں جانب مجھے اپنے حصار میں لیے دو اور سوار تیزی سے چل رہے ہیں لیکن نہ مجھے اپنا گھوڑا دکھائی دے رہا ہے نہ ان کا۔ صرف شائیں شائیں کی آوازیں تھیں اور ہم اڑے چلے جا رہے تھے۔ دوران سفر سامنے ایک بڑا دریا دکھائی دیا میں خوفزدہ ہو گیا یا اللہ اب میں اس دریا میں غرق ہوا لیکن مجھے کچھ بھی نہ ہوا۔ ہوا کے دوش پر میں دریا عبور کر چکا تھا۔ مجھے آنکھوں پر یقین نہ ہوا۔ میں نے گھبرا کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ میرے چہرے پر آنکھوں کا کوئی وجود نہ تھا پھر بھی میں دیکھ سکتا تھا۔ ڈر کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ ''تم لوگ کون ہو اور مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟ اس سے پہلے کہ کوئی جواب ملتا میرا جسم ذرّات میں بدل کر ہوا میں تحلیل ہو گیا لیکن میرا وجود اب بھی باقی تھا۔ ایک سفید چمکیلی روشنی

میرے وجود کے چاروں طرف پھیل گئی دیکھتے ہی دیکھتے میں سفید روشنی کے دائرے میں مقید تھا۔ چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی پر ناکام رہا۔ ایک آواز کانوں سے ٹکرائی ''جناب آپ کا مجرم ہم لے آئے'' ''میں اور مجرم؟'' میں سوچنے لگا ''ہاں! ہاں...... تم۔ تم ہی اصل مجرم ہو۔'' ایک بارعب آواز فضا میں دور تک گونج گئی۔

میں رونے لگا...... ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا، میں بے قصور ہوں، مجھے چھوڑ دو۔ آپ کسی سے پوچھ لیں'' ''پوچھ لوں......؟ کس سے...... تمھارا کوئی گواہ بھی ہے؟''

''میرا گواہ......؟ کہاں سے لاؤں میں گواہ؟ پھر یاد آیا۔'' ''ہاں، ہاں میرا گواہ ہے اچانک مجھے اپنے عزیز ترین نیتا جی کا خیال آیا۔ ہمیشہ میں ان کے کام آیا ہوں۔ ہزاروں بوگس ووٹ ڈلوائے ہیں۔ ان کے اشارے پر انتخاب کے دوران پولنگ بوتھ پر جبراً قبضہ کیا ہے۔ آج وہ میری گواہی ضرور دیں گے؟''

''تم یہاں بھی جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہی آواز دوبارہ کانوں سے ٹکرائی۔

''کس نیتا کی بات کر رہے ہو یہاں بے شمار نیتاؤں کی بھیڑ جمع ہے جو خود جھوٹ کا پلندہ ہیں۔''

بارعب آواز سے اس قدر خوفزدہ ہوا کہ میری گھگھی بندھ گئی۔

''اسے نیتاؤں کے حالات دکھاؤ۔'' بارعب آواز نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ بجلی کا ایک شرارہ چمکا میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ چند ہی لمحوں میں میرے سامنے جو منظر تھا دل دہلانے والا تھا۔ ملک کے سبھی بڑے بڑے رہنما عوام سے سنہرے وعدے کرنے والے۔ عوام کو جو سبز باغ دکھا کر ذہنی استحصال کرتے تھے ان کے پیروں میں بڑے بڑے اژدہے کنڈلی مارے ہوئے تھے ان کے منھ سے آگ کے شعلے نکل کر نیتاؤں کے چہروں کو جھلسا رہے تھے۔ ان کی زبانیں گھٹنوں تک لٹکی ہوئی تھیں۔ آنکھیں اپنے حلقے سے باہر نکلتی اور واپس ہو رہی تھیں کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سامنے ایک خطرناک گڑھا تھا جس سے آگ کی وہ ہیبت ناک لپٹیں نکل رہی تھیں کہ سورج بھی منہ چھپا لے۔ سفید لباس میں ملبوس نیتاؤں کی سیاہ سدری جو کبھی ان کے سیاسی رہنما ہونے کی پہچان تھی ان کے داغی نیتا ہونے کا ثبوت بن گئی تھی۔ تمام نیتا گڑگڑا رہے تھے۔

زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے جیسے وہ الیکشن کے زمانہ میں غریب عوام کے آگے کاسۂ گدائی پھیلاتے ہیں ووٹ کی بھیک کے لیے۔ فرق اتنا تھا کہ وہاں وہ لومڑی سی مکاری سے ووٹ مانگتے لیکن یہاں تو ساری مکاری فنا ہو چکی تھی۔ اتنے میں میں نے دیکھا میرے نیتا جی کو کچھ لوگ زنجیروں میں جکڑے درے مارتے لیے آ رہے ہیں۔ اب جو یہ حال میں نے دیکھا تو دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ کیا میری گواہی دیں گے۔ ان کی تو حالت خود غیر ہے۔ میں نے انھیں بارہا آواز دی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بھڑکتے شعلے کے نزدیک لا کر انھیں کھڑا کیا گیا۔ وہی بارعب آواز فضا میں ابھری......

''بتاؤ! تمھارے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟'' تم نے عوام کے ساتھ کیسی کیسی مکاریاں کی ہیں کیسے کیسے ظلم کیے ہیں۔ کتنا استحصال کیا ہے۔ کیا تم نے ملک میں فساد برپا نہیں کیا۔ کیا تم نے نفرت کے خاردار درخت نہیں اگائے کیا تم نے دلوں کو جوڑنے کے بجائے محض حصول اقتدار کے لیے انسان کو انسان سے نہیں لڑایا۔ بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے؟ ہے کوئی جواب تمھارے پاس؟ ''میں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ میں تو عوامی خدمتگار ہوں۔ عوام نے میرا انتخاب کیا۔ میں ان کا رہنما ہوں میں تو ملک میں راشٹر واد لانا چاہ رہا تھا۔''

''تم یہاں بھی جھوٹ بول رہے ہو، کوئی گواہ ہے تمھارا......؟''

نیتا جی کی زبان ہلی ''یہاں تو میرے علاوہ کوئی نہیں کہاں سے لاؤں میں گواہ اور آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے جرم کیا، میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' نیتا جی ڈھیٹ کی طرح بولے۔

''بے وقوف تمھارے جرم کا پتہ ابھی تمھیں معلوم ہو جائے گا، اسے اس کے جرم بتاؤ۔'' اتنا کہنا تھا کہ نیتا جی کے دونوں ہاتھ زبان میں تبدیل ہو گئے اور بولنے لگے۔ ''میرے مالک تو نے اس شخص کے ماتحت مجھے کر دیا تھا تا کہ یہ لوگوں کی بھلائی کے کام کرے لیکن اس نے میرا استعمال لوگوں کو قتل کرنے، عورتوں کی بے حرمتی کرنے بچوں کو نذر آتش کرنے میں کیا یہی نہیں اس نے اپنے حمایتیوں کو بھی ایسا عمل کرنے کی تحریک دی۔ میں یہ منظر دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ نیتا جی کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی بولنے لگیں۔ ''میں اس شخص کے پاس تیری عظیم دولت بصیرت تھی لیکن اس نے میرا استعمال ملک کے ایک خاص فرقے کے لیے گدھ کی طرح کیا۔ انھیں متحد اور آباد دیکھ کر

قتل کرانے کی سازش رچی کیونکہ اسے ان لوگوں سے نفرت تھی سخت نفرت۔اس کے آنکھوں کے اشارے نے ہزاروں عورتوں، بچوں اور جوانوں کو موت کی نیند سلادیا۔اس کی حریص نگاہ نے انسانی لاشوں پر چل کر مسند اقتدار کو حاصل کرنا چاہا۔ میں کیا کرتا میں تو اس کے ماتحت تھا۔'' آنکھوں نے خاموشی اختیار کی تو نیتا جی کی زبان بھی ان کی مخالف ہوگئی۔''اس شخص نے عوام میں سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے عورتوں اور مخالفوں کو غیر اخلاقی جملے کہتا تھا۔ میرا استعمال نفرت کی دیوار کھڑی کر کے قوم، مذہب، ذات کی بنیاد پر لڑانے میں کیا۔جس جگہ لوگ قومی یکجہتی کی مثال تھے وہاں اس نے زہرافشانی کی جس کے نتیجہ میں صدیوں کا اتحاد لمحہ بھر میں پارہ پارہ ہوگیا اور لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔''

اب نیتا جی کے پیر بھی مخالفت پر آمادہ ہوگئے۔اس نے کہا ''یہ درندہ صفت انسان ہمیں ان مقدس مقام پر لے گیا جس کے آنگن میں صدیوں تک خدا کے بندوں نے سر جھکایا تھا۔اور اس نے اپنے جنونی ہمنواؤں کے ساتھ ایک تاریخ ساز عبادت گاہ کو زمین بوس کیا۔اس نے جان بوجھ کر میرا غلط استعمال کیا۔'' اس کے بعد سبھی اعضا اپنی اپنی شکل میں آگئے۔نیتا جی کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔وہ بالکل بے بس، مجبور اور شرمندہ سے کھڑے تھے۔کچھ دیر پر ہول سناٹا رہا پھر ایک غضبناک آواز آئی۔اس شخص نے اپنے منصب، طاقت اور دولت کا بیجا استعمال کیا۔لہٰذا اسے ان دہکتے شعلوں کی عمیق گہرائیوں میں پھینک دو ساتھ ہی اس شخص کو بھی جس نے ہمہ وقت اس سیاہ کار رہنما کے ہاں میں ہاں ملایا۔ایسے ہی حمایتیوں نے ان نام نہاد جمہوری رہنما کو غلط راستوں پر چلنے میں شہہ دی۔اسے بھی اس کے نیتا کے ساتھ بھٹی میں ڈال دو۔اتنا کہنا تھا کہ مضبوط ہاتھوں نے مجھے پکڑا اور مجھے بھی نیتا کے ساتھ دہکتے شعلوں کے غار میں پھینک دیا اور میری چیخ نکل گئی۔

نہیں.......نہیں.......ں.......توبہ، توبہ، توبہ.......اب کسی کی حمایت نہیں کروں گا.......توبہ.......توبہ۔

آپ کیا شور کر رہے ہیں کیا ہوگیا آپ کو، اچھے بھلے بستر پر تھے نیچے کیسے گر گئے۔میری بیوی جھنجھوڑ رہی تھی۔ بیوی نے ...گلاس پیش کیا۔میری آنکھ کھل چکی تھی اور میں نے اگلے دن اپنا راستہ بدل دیا!!

☆☆☆

تلاش گمشدہ

میں صبح سویرے جیسے ہی دودھ لانے کے لیے باہر نکلا گلی کے نکڑ پر کافی بھیڑ تھی۔ میں تیزی سے قدم بڑھاتا اس طرف چل دیا۔ راستے میں طرح طرح کی سرگوشیاں ہو رہی تھی۔

''ارے بھائی صاحب، ساٹھ پینسٹھ کی عمر ہو چکی تھی لیکن روزانہ ٹی وی دیکھنے کمیونٹی ہال میں آجاتے'' کوئی کہہ رہا تھا'' تھے تو بڑے شریف آدمی لیکن آج تک کوئی عزیز رشتہ دار نظر نہ آیا۔'' میں آگے بڑھتا رہا ایک جانب سے آواز آئی ''اتنا تو سچ ہے کہ ان کے آنے سے محلے کے ناخواندہ بچوں میں خواندگی آ گئی۔ بہت سے بچے تو اسکول بھی جانے لگے۔''

''ہاں ہاں، بالکل درست ہے بڑے نیک آدمی تھے لیکن آج تک پتہ نہیں کہاں سے آئے تھے، کون تھے ان کا کوئی عزیز تھا یا نہیں؟'' بھیڑ میں سے آواز آ رہی تھی۔ میں اب نکڑ پر پہنچ چکا تھا۔ انور چچا کے گھر کے سامنے لوگ کھڑے تھے۔

''کیا ہوا منظور بھائی خیریت تو ہے؟''

''انور چچا کا رات انتقال ہو گیا۔ بہت دیر تک دروازہ نہ کھلا تو لوگوں کو شک ہوا بہت دستک دینے پر جب کوئی جواب نہیں ملا تو پڑوس کے مکان سے انور چچا کے مکان کے آنگن میں اتر کر دیکھا گیا تو وہ بستر پر ساکت تھے۔''

میرا سر چکرا گیا، زمین گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے کل ہی کی بات ہے جب وہ کمیونٹی ہال سے ٹی وی دیکھ کر واپس جا رہے تھے تو کئی

لوگوں نے طنزیہ لہجہ میں فقرہ کسا تھا ''اس بڑھاپے میں بھی انور میاں ٹی وی دیکھنا نہیں بھولتے۔'' اور انھوں نے رک کر جواب دیا تھا۔ ''بھائی اگر تم لوگوں کو میرا آنا برا لگتا ہے تو میں کل سے نہیں آؤں گا'' اور بوجھل قدموں سے وہ اپنے مکان کی طرف چل دیے تھے۔

انور صاحب زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکے تھے۔ شریک سفر کوئی نہ تھا بچے تھے جو تعلیم مکمل کر کے اپنے اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے تھے۔ ایک بیٹی تھی جو شادی کے بعد امریکہ جا بسی تھی۔ بچا بیٹا تو اس کا بھی گھر بسا کر بڑے اطمینان سے زندگی گزار رہے تھے۔ انور صاحب نے اپنے کمرے میں چھوٹی سی لائبریری قائم کر رکھی تھی۔ انھیں مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ ہر موضوع پر کتابیں دستیاب تھیں۔ پنشن کا روپیہ آتا تو بیشتر کتابیں ہی خرید لیتے۔ زندگی بڑے مزے سے کٹ رہی تھی...... لیکن ایک دن ان کے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی ''عرفان، میرے بھائی اور بھابھی آ رہی ہیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے...... تمھیں تو خوش ہونا چاہیے'' عرفان نے بات کاٹ کر کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایک پرابلم ہے۔'' ''وہ کیا......؟'' عرفان نے سوالیہ نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ ''بھابھی اور بھیا کہاں قیام کریں گے؟'' ''بات تو تمھاری درست ہے...... لیکن گھبراؤ نہیں انتظام کرلوں گا'' عرفان نے بے فکری سے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں پاپا تو بالکل تنہا ہیں اور ان کا کمرہ بھی کافی بڑا ہے کیوں نہ اسی میں انتظام کر دیا جائے۔'' ''اور پاپا......؟ وہ کہاں رہیں گے؟'' ''ارے ان کے لیے باہر والا روم ہے وہیں انتظام کر دیں گے۔''

انور صاحب اپنے کمرے سے نکل کر باہر ایک چھوٹے سے بنے گیسٹ روم میں منتقل ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کے لمبے راستے میں سایہ دار درخت کے نیچے چلتے چلتے اچانک پت جھڑ آ گیا۔ درخت کا ایک ایک پتہ ٹوٹ ٹوٹ کر قدموں میں آ رہا اور سورج کی تمازت نے سر پر سایہ کر لیا۔ پہلی بار عملی طور پر محسوس ہوا کہ کتاب تنہائی کا بہترین ساتھی ہے۔ وہ سوچنے لگے کتنی جانفشانی سے عرفان کو پڑھایا تھا، زندگی کی تمام پونجی کے عوض ڈاکٹر بنایا، وہ شہر کے ہر بیمار کا علاج کرتا ہے لیکن خود اپنے باپ کو ذہنی مریض بنا دیا۔ میرے برسوں کی شفقت کا یہ صلہ ہے کہ میں کسی فضول شے کی طرح باہر پھینک دیا گیا ہوں۔ تکیے سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے وہ انھی

خیالوں میں گم تھے کہ نوکر نے آواز دی۔ ''صاحب کھانا لایا ہوں۔''

''اوں...... ہاں......'' یک لخت وہ چونکتے ہوئے بولے ''کیا بات ہے آج کھانا تم یہاں لائے ہو، ڈائننگ روم......'' ابھی وہ کچھ بولتے کہ نوکر نے بات کاٹ دی۔ ''وہ ایسا ہے کہ عرفان بابو مہمانوں کے ساتھ پکنک پر گئے ہیں مجھے کہہ گئے کہ پاپا کو ان کے روم میں ہی کھانا دے دینا۔'' ''ٹھیک ہے رکھ دو'' کھانا ٹیبل پر رکھ کر نوکر چلا گیا لیکن چھوڑ گیا چند سوالات۔

''کیا عرفان کے دل میں میری عزت کم ہوگئی......؟'' ''یا اب میں بوجھ ہوں؟'' کیا عمر کے اس موڑ پر والدین بچوں کے لیے بیکار شے بن جاتے ہیں۔ جس کی اہمیت ان کی نظروں میں کچھ نہیں رہتی۔ اگر ایسی بات ہے تو میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ سچ ہے درخت کا سایہ کبھی درخت کے کام نہیں آتا۔'' اور ایک دن انور صاحب بغیر کسی کو کچھ بتائے گھر سے نکل گئے۔ اپنے شہر سے دور انجانے شہر کے ایک محلے میں کرایہ کا مکان لے کر رہنے لگے۔ ان کی فطرت اور علمی لیاقت نے بہت جلد محلے والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا اب وہ دن بھر محلے کے ان بچوں کو تعلیم دیتے جو اسکول کی فیس نہیں دے سکتے تھے۔ محلہ میں بھی لوگ بہت عزت کرتے تھے، مگر انور صاحب دن بھر خواہ جس قدر مصروف ہوں لیکن شام کے پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک بلاناغہ ٹی وی ضرور دیکھتے، یہ روزانہ کا معمول تھا۔ پندرہ سال کی مدت گزر گئی، جسم میں کمزوری بھی آنے لگی جو بچے دس سال کے تھے وہ اب پچیس سال کے ہو چکے تھے۔ ایک لمبا عرصہ گزر گیا۔ آنکھوں کے چشمے کے کئی بار شیشے بدل گئے مگر وہ ٹی وی دیکھنا نہیں بھولتے۔ ایک دن ایک لڑکے نے ٹوک دیا ''چچا...... یہ عمر آچکی، قبر میں پیر لٹکائے ہو آنکھوں کی روشنی کم ہوگئی لیکن ٹی وی دیکھنا نہیں چھوڑتے اب اس عمر میں کیا دیکھنا......'' لڑکے کی بات سن کر انور صاحب ٹھہر گئے اور بڑی نرمی سے کہا...... ''بیٹے تو نے درست کہا لیکن بات وہ نہیں جو تم سوچ رہے ہو۔ سچ یہ ہے کہ پندرہ سال سے میں صرف ایک ہی پروگرام دیکھتا ہوں...... ''تلاشِ گمشدہ''

'کھوئے ہوئے لوگوں کی تلاش پروگرام دیکھتے ہیں......؟ کیا آپ کا کوئی کھو گیا ہے؟''

''نہیں میرے بچے میرا کوئی نہیں کھویا ہے بلکہ میں ہی خود سے کھو گیا ہوں اور ہر روز یہی دیکھنے آتا ہوں کہ شاید کوئی مجھے تلاش کرتا ہو اور میری تصویر، نام، رنگ، قد اور عمر کا ذکر ٹی وی

پڑ جائے بس اسی انتظار میں روزانہ ٹی وی کے سامنے بیٹھتا ہوں۔ تمھیں میرا آنا برا لگتا ہے کوئی بات نہیں کل سے نہیں آؤں گا۔'' انھوں نے پیار بھری ایک نگاہ لڑکے پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے، چھڑی کے سہارے اپنے مکان کی جانب چل دیے۔

ان کی زبان سے نکلی بات اللہ نے شاید قبول کرلی۔ اب وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ سایہ دار درخت کا آخری پتہ بھی زمین بوس ہو چکا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا محلے کے لوگ جنازے کو منزل تک پہنچا کر لوٹ آئے لیکن اس دن سے کمیونٹی ہال کا ٹی وی ہمیشہ کے لیے بند کردیا گیا...... انور صاحب کی موت کے سوگ میں یا پھر ٹی وی کی اس ناکامی پر کہ وہ کسی ہجر نصیب بوڑھے کی انتظار سے تشنہ آنکھوں کو سیراب کرنے میں ناکام رہا تھا۔

☆☆☆

سکے کا دوسرا رخ

اجمل صاحب بڑے دیندار آدمی تھے اور دولتمند بھی۔ ملک اور بیرون ملک ان کی بڑی عزت تھی۔ بڑے اچھے مقرر اور خدا ترس انسان تھے۔ سماج میں لوگ انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب بھی کہیں کوئی تقریب ہوتی لوگوں کو نیک عمل کی تلقین کرتے۔ لوگوں کو اپنے اعمال درست کرنے کی ترغیب دیتے۔ کوئی بھی مجلس ہو، وہ اللہ کے حکم اور رسولؐ کی پیروی کرنے پر زور دیتے، آخرت کا خوف دلاتے اور اپنی بات کے دوران لوگوں کو مخاطب کرتے وقت ایک مخصوص شعر ضرور سناتے۔

ٹھکانہ گور ہے تیرا عبادت کچھ تو کر غافل
کہاوت ہے کہ خالی ہاتھ گھر جایا نہیں کرتے

"آدمی کو ہر لحہ نیکی کی کوشش کرنا چاہیے، مجبوروں کی مدد، بے کسوں کو سہارا، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا، بیمار کی عیادت کرنا ہمارے پیارے نبیؐ کا طریقہ تھا، ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ اس عمل سے کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔ نماز قائم کریں یہ دین کا ستون ہے۔" ایسی دینداری اور اسوۂ حسنہ کی باتیں سن کر عوام متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ مسجدوں میں صفیں بڑھنے لگیں۔ معاشرے میں انقلاب کی آہٹ محسوس ہونے لگی۔ اجمل صاحب کے اخلاق اور دینداری کا چرچہ ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا۔ ایک مجلس میں اجمل صاحب بھی مدعو تھے۔ میزبان ان کے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ تمام لوگ بھی ان سے گھل مل گئے تو ایک صاحب مجلس نے کہا "اللہ رب العزت نے اپنے کرم سے آپ کو نوازا ہے۔ ہر طرح کی آسائشیں آپ کو عطا کی ہیں

لیکن آپ کو قطعی اپنی دولت کا گھمنڈ نہیں۔آپ درویش صفت ہیں، دیندار ہو تو آپ جیسا۔

''ارے نہیں جناب! اللہ کے واسطے اس طرح شرمندہ نہ کریں۔'' اجمل صاحب نے عاجزی وانکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''دینِ اسلام نے ہمیں غم زدہ لوگوں کی غمگساری، بے سہارا لوگوں کی امداد کا سبق سکھایا ہے۔ نیکی یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے کام آئیں۔'' بالآخر مجلس برخاست ہوگئی۔

ایک دن اجمل صاحب اپنی کوٹھی کے لان میں بیٹھے تھے۔ان کی بیٹی ان سے نئے سوٹ کی فرمائش کررہی تھی۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا ''بیٹی! تمھارے پاس پہلے ہی سے کئی قیمتی سوٹ موجود ہیں اوواب نیا سوٹ لے کر کیا کروگی۔''

''پاپا...... آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میری عزیز سہیلی کا برتھ ڈے ہے اور آپ کی بیٹی پرانے لباس میں جائے گی۔ آخر آپ کی بھی تو سبکی ہوگی؟''

''اچھا اچھا...... خرید لینا۔ میں دفتر سے چیک بھجوادوں گا۔اور سنو...... اس وقت میں اپنے دفتر جارہا ہوں۔ بیرونِ ملک سے ایک بڑی پارٹی آئی ہے ان سے ملنے کو وقت دیا ہے ان سے چندہ لینا ہے۔'' کہتے ہوئے انھوں نے اپنی چمچماتی ہونڈا سٹی کار کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ ان کا ایک ملازم بھاگتا ہوا آیا۔ وہ بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا بات ہے اس طرح حواس باختہ کیوں چلے آرہے ہو؟'' اجمل صاحب غضب ناک لہجہ میں غرائے۔ کیا تم نہیں جانتے اس وقت میں بہت ہی اہم کام سے جارہا ہوں۔؟''

ملازم گڑگڑانے لگا...... ''معافی چاہتا ہوں جناب۔ اچانک بڑی مشکل میں گھر گیا ہوں۔ اسکول سے لوٹتے وقت ایک کاروالے نے میرے بیٹے کو ٹکر ماردی ہے۔ وہ بری طرح زخمی ہے ایک التجا ہے، آپ ڈرائیور سے کہہ دیں کہ میرے بیٹے کو ہسپتال تک پہنچادے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا، اللہ آپ کو جزائے خیر سے نوازے گا جناب۔''

''تمھارا دماغ تو ٹھکانے پر ہے میں خود بہت ضروری کام سے جارہا ہوں اگر دیر ہوگئی تو لاکھوں کا نقصان ہوجائے گا۔ تمھارے چکر میں اپنا نقصان برداشت نہیں کرنے والا۔'' وہ گرجدار آواز میں چیخے ''میرا منھ کیا دیکھ رہے ہو جاؤ یہاں سے۔''

ملازم ہکا بکا اجمل صاحب کو دیکھتا رہ گیا اور وہ اپنی امپورٹیڈ کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ دینداری کی تقریر ہمدردی کا درس، اسوۂ حسنہ کی تلقین، آخرت کا خوف لوگوں کو دلانے والے اجمل صاحب کا یہ روپ شاید سکے کا دوسرا رخ تھا۔!!

☆☆☆

صندل کی فطرت

سیما اسکول سے لوٹی تو بہت پریشان تھی۔ ماں نے پوچھا ''کیا بات ہے بیٹی تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے؟'' اس کے چہرے پر شرم اور خوف کا ملا جلا تاثر تھا۔ ماں کے زور دے کر پوچھنے پر اس نے سارا حال صاف صاف بتا دیا اور اپنے کمرے میں جا کر رونے لگی۔ شام جب سیما کے والد گھر آئے تو بیوی نے ساری باتیں بیٹی کے بارے میں بتا دیں۔ عظیم احمد کے ماتھے پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔ رات بھر انہیں نیند نہ آئی۔ پڑوس کے ہی ایک لڑکے نے ان کی بچی پر فقرے کسے تھے۔ اس بات سے پریشان وہ اس عذاب سے چھٹکارے کی ترکیب سوچ رہے تھے۔ آخر کار نتیجہ پر پہنچے کہ تھانہ میں جا کر رپورٹ درج کرا دی جائے۔

عظیم احمد اسکول میں استاد تھے۔ نہایت شریف اور نیک طبیعت انسان، محلے کے لوگ بڑی عزت کرتے تھے کیا مسلم کیا غیر مسلم وہ ہر اک کے محترم شخصیت تھے ان کی تدریس سے نہ جانے کتنے طالب علم فارغ ہو کر اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہو چکے تھے۔ ایک استاد کے حصے میں یہی ایک انعام آتا ہے کہ اس کا طالب علم حصول تعلیم کے بعد جب ذمہ دار منصب پر فائز ہوتا ہے تو اس خوشی کا احساس سوائے استاد کے کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اپنے اسی اعتماد پر نازاں عظیم صاحب شہر کے تھانہ میں جا پہنچے لیکن تھانہ میں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے پریشان ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی جب کوئی نہ ملا تو مایوس ہو کر واپس لوٹنے کو تھے کہ ایک بارعب آواز نے ان قدم روک لئے۔

'اے! کس سے ملنا ہے......؟'' عظیم صاحب نے آواز کی طرف نظریں گھمائیں۔ تھانہ کے احاطے میں ہی ایک نل کے پاس نیکر اور بنیان میں ملبوس ایک شخص کھڑا تھا۔ آواز اسی

طرف سے آئی تھی۔ انہیں یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ علاقے میں امن وامان قائم رکھنے اور عوام کو حفاظت فراہم کرنے کا ذمہ اسی کے پاس ہے۔

''شکایت درج کرانا ہے۔'' عظیم صاحب نے اعتماد سے کہا ''کس بات کی شکایت؟'' منہ سے برش نکال کر اس نیم عریاں شخص نے زور سے تھوکا اور پوچھا۔

''جناب! بات یہ ہے...... '' عظیم صاحب زبان کھولتے ہوئے جھجک رہے تھے۔

''کیا بات ہے جلدی بولو میرے پاس وقت نہیں ہے'' اس شخص نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کرخت آواز میں کہا۔ عظیم صاحب کے حلق میں جیسے بات پھنس گئی تھی اس تھانیدار کی غراہٹ سن کر فوراً بول پڑے ''میری بیٹی کو پڑوس کا لڑکا اسکول آتے جاتے فقرے کستا ہے۔ یہ تو بڑی بدتمیزی ہے۔ آپ کچھ کریں۔''

''یہ تو معمولی بیماری ہے کوئی مہلک مرض کا مسئلہ ہو تو تحریر لکھ کر دیدو میں تحقیقات کروں گا۔''

''مہلک مرض......؟'' ''جناب مرض نہیں۔''

وہ ابھی اور کچھ بولتا کہ تھانیدار نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ ارے بھائی کوئی عزت تو برباد نہیں ہوئی۔''

یہ سن کر ہی ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ عظیم صاحب نے کہا جناب! میں ایک ٹیچر ہوں بچوں کو قانون کو ماننے اور احترام کرنے کا سبق پڑھاتا ہوں۔ راہ چلتے دوشیزاؤں پر اوچھے فقرے چست کرنا غیر قانونی ہے اور اخلاقی پستی بھی۔ آپ قانون کے محافظ ہیں آپ کو میری مدد کرنی چاہیے۔ اور آپ ہیں کہ......''

''کیا ہوں میں......اور کیا کروں میں بتائیے؟ صرف اصول کی بات کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ماسٹر۔ قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں لیکن اس ہاتھ کو لمبا کرنے کے لئے جس طاقت کی ضرورت ہوتی ہے لے کر آئے ہیں......؟'' تھانیدار نے کڑک کر سوال کیا۔

عظیم صاحب خاموش تھانیدار کا منھ تکتے رہ گئے۔ ''اب میرا منھ کیا دیکھ رہے ہو۔ ماسٹر ہو یا بت ہو۔ کچھ خرچے پانی کی بات کروگے یا سوکھے قلم کو ہی کاغذ پر چلاؤں؟'' قانون کے محافظ نے بے لگام ہو کر سرپٹ زبان کا گھوڑا دوڑایا اور عظیم صاحب حیرت سے اسے دیکھتے رہے۔

''آپ رشوت مانگ رہے ہیں؟ یہ تو قانون کے خلاف ہے بلکہ جرم ہے۔ میں نے سالہا سال بچوں کو یہی درس دیا ہے۔''عظیم صاحب نے ہمت جمع کر کے جواب دیا۔

''ہا........ہا........ہا........ہا''اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔''بھولے ماسٹر تم جس زمانے کی بات کر رہے ہو اسے گزرے تو صدیاں بیت گئیں۔ آج کا قانون اپنی پرانی کتابوں کے دائرے سے باہر نکل آیا ہے۔ پرانے کتابوں میں قانون نہیں وہ مردہ الفاظ ہیں اس نئے دور میں ان کی غلامی بیوقوفی ہے۔ یہ نیا دور ہے اس لئے نیا قانون چلتا ہے اگر میری بات تم سمجھ گئے ہو تو ساتھ چلوں ورنہ مجھے اور بھی کام ہے۔'' یہ کہہ کر تھانیدار جانے لگا۔ جواب سن کر عظیم صاحب چند لمحہ کے لئے خاموش رہے لیکن اپنی عزت کی خاطر حامی بھر دی۔ نتیجہ خیال کے مطابق نکلا۔ وہ لڑکا تھانیدار کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ اور آگے ایسی غلط حرکت نہ کرنے کا وعدہ کیا، تب تھانیدار نے اسے چھوڑ دیا۔

عظیم صاحب اب اطمینان سے اپنے اسکول پہنچے لیکن بے وجہ روپے کی بربادی پر انہیں افسوس تھا جو رشوت کی شکل میں نکل گیا تھا لیکن اسکول میں ایک دوسری خاکی وردی والا شخص ان کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی سامنا ہوا، خاکی پوش افسران کے سامنے ادب سے کھڑا ہو گیا۔''جی! فرمائیے۔'' عظیم صاحب نے پوچھا۔''آپ میرے بیٹے کے Examiner ہیں اسی لئے اس کا خاص خیال کرنے کی التجا کرنے آیا ہوں۔'' خاکی وردی والے نے صاف صاف اپنی بات کہہ دی۔

عظیم صاحب کو صبح ہی صبح نئے زمانے کے قانون کی کتاب کا کرشمہ دکھائی دے گیا تھا۔ اس لئے فوراً بولے''جناب! التجا صرف خدا سے کی جاتی ہے، ہم زمین پر رہنے والے ہیں زمین کی بات کریں تو بہتر ہوگا۔''

''کیا یہاں بھی نئے زمانے کا زمینی قانون چلتا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے خاکی وردی والے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اپنی عزت کو محفوظ رکھنے کے لئے میری جیب آج ہی خالی ہوئی ہے بات جب نئے زمانے کی ہے تو قانون بھی نیا چلنا چاہیے۔''عظیم صاحب نے چھپاتے ہوئے بھی ساری بات کھول دی۔ وردی والا افسر شاید اسی لمحے کا منتظر تھا اس نے اپنی جیب سے ایک ضخیم لفافہ نکال کر ماسٹر عظیم صاحب کے پرانے کوٹ کی ہلکی جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ عظیم صاحب کی نظر اپنے

درجہ کے تختۂ سیاہ پر خود انہیں کے ہاتھ کی لکھی تحریر پر مرکوز ہوگئی۔ سانپوں کے لپٹنے سے صندل اپنی فطرت نہیں بدلتا اس کی خوشبو بے ضرر ہوتی ہے۔''

عظیم صاحب نے بڑے انکساری سے خاکی وردی والے سے کہا۔

''معاف کیجئے گا' اس لفافے کی ضرورت مجھ سے زیادہ آپ کو ہے۔ میرے لئے میرے سبھی طالب علم برابر ہیں۔ یہاں تو قانون کی پرانی کتاب ہی رائج ہے زمانہ بدلتا ہے تو بدلتا رہے'' خاکی وردی والے کا اٹھا ہوا ہاتھ کانپنے لگا۔ شرمندہ ہوکر اس نے لفافہ اپنی جیب میں واپس ڈال لیا مگر بڑے تپاک سے اس نے عظیم صاحب سے مصافحہ کیا ہاتھ کی سختی اس کے فطرت میں آئی تبدیلی کا احساس کرا رہی تھی۔ عظیم صاحب پھر اپنے درجہ میں طلبہ سے مخاطب ہوگئے۔

☆☆☆

جنون

شرافت علی ڈرائنگ روم میں بیٹھے چائے کا لطف لے رہے تھے۔ ان کی بیوی بیٹھی ان کے لیے سلائس پر مکھن لگا رہی تھیں۔ دونوں اپنے گھریلو ماحول پر محوِ گفتگو تھے کہ دروازہ کھلا اور اریب علی کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا بات ہے بیٹے اسکول نہیں گئے؟''

''ابو! آج اسکول بند کر دیا گیا''

''وہ کیوں......؟'' شرافت علی نے استفسار کیا۔

''ابو! میرے اسکول کے ایک طالب علم کا قتل ہو گیا ہے اسی لیے دو منٹ کی خاموشی اور دعائے مغفرت کے بعد تعلیمی کام معطل کر دیا گیا''

''قتل......؟؟؟'' شرافت علی چونک گئے۔ ان کی بیوی بھی حیرت زدہ ہو گئیں۔

''بڑا خراب زمانہ آ گیا ہے...... بھلا بتائیے اتنے چھوٹے بچے کا قتل...... انسان بالکل جانور ہو گیا ہے'' بیوی تبصرہ کرتے ہوئے اریب کے بیگ اتارنے میں مصروف ہو گئیں۔

''اریب کی ماں! کچھ کہا نہیں جا سکتا...... جب معاشرہ اپنے اخلاقی اصولوں سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اس کے دلوں سے خالق کائنات کا خوف اٹھ جاتا ہے اور آخرت پر یقین نہیں ہوتا تب ایسے ہی واقعات رونما ہوتے ہیں'' کہتے ہوئے شرافت علی نے ٹیبل پر رکھے آج کے اخبار کو اٹھایا...... سرورق پر جلی حرفوں میں چھپی خبر اور مختلف زاویوں سے لی گئی تصویریں دیکھ کر وہ یکا یک چونک سے گئے۔ ہاتھ کانپنے لگا پورا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ایسا لگا دل اچھل کر

حلق میں آ گیا۔ ان کی آنکھیں پھٹی پھٹی بالکل ساکت ہو گئیں۔ آنکھوں کے حلقوں سے گرم گرم پانی ان کے رخسار پر پھسلتے ہوئے ٹپکنے لگے بیوی نے ان کی یہ حالت دیکھی تو چیختی ہوئی دوڑیں ''کیا ہوا...... آپ کچھ بولتے کیوں نہیں'' جلدی سے ہاتھ سے اخبار لے کر ٹیبل پر رکھا اور اور ان کے چہرے پر پانی کے چھینٹے ڈالتی ہوئی بولیں...... کتنی بار کہا کہ اخبار میں چھپی قتل و غارت گری کی خبریں نہ پڑھا کریں۔ کمبخت یہ اخبار والے کوئی تعمیری بات تو چھاپتے نہیں صرف خون خرابہ، زنا، طلاق، ان کے پاس یہی خبریں بچی ہیں۔ ٹی وی چینلز کا بھی یہی حال ہے اور اخباروں کا بھی'' وہ اخبار والوں پر برس رہی تھیں۔ ''کیا ہو گیا ہے آپ کو مجھے کچھ بتائیں گے بھی یا......'' ابھی وہ بات پوری بھی نہیں کر پائیں کہ شرافت علی کے لب ہلے۔ ''جس بات کا ڈر تھا آخر کار وہ ہو کر رہا''

شرافت علی اور وجاہت علی دو بھائی تھے دونوں اپنے پشتینی مکان میں رہتے تھے۔ بڑا خوشحال گھرانہ تھا۔ شرافت علی بڑے تھے اور وجاہت علی چھوٹے۔ گھرانہ خوشحال ہونے کے سبب دونوں بھائیوں میں بہت محبت تھی۔ دونوں کے بچے بھی اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے شرافت علی بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ دیندار بھی تھے روزہ نماز کے پابند تھے اور خوش اخلاقی کو انھوں نے اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ ہر وقت اسوۂ حسنہ سے متاثر ہو کر سنت پر چلنے کی سعی میں مصروف رہتے۔ انھی اسباب سے انھوں نے اپنے بچوں کو بھی دینی نہج پر چلنے کی تلقین کی اور ابتدائی تعلیم بھی دینی درسگاہ میں دلائی تاکہ بچوں میں خالقِ کائنات اور روزِ آخرت پر پختہ یقین ہو جائے اور وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہنے کا گر سیکھ لیں۔ انسان جب اپنے خاندان کو سنوارنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اسے ہدایت فرماتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ شرافت علی کے بچے نیک، سلجھے ہوئے اور دینداری پر عمل کرنے والے بنتے گئے۔ رہن سہن، گفتگو، عادت و اطوار ہر بات میں دین کا پرتو جھلکتا تھا۔ دوسری جانب ان کے چھوٹے بھائی وجاہت علی بھی ایک نیک دل انسان تھے درس و تدریس کے شعبہ سے منسلک تھے لیکن زمانے کی بہتی جدّت کی ہوا نے انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ خود تو پابند صوم صلوٰۃ تھے لیکن انھوں نے اپنی عادت کو اپنے بچوں میں منتقل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی لہٰذا ان کے بچے جدید طرز رہائش، جدید فیشن کے لباس، اور بالکل آزاد خیال زندگی گزارنے کے عادی بن گئے خاص کر بیٹی شبنم آزادی نسواں کے مفہوم کا غلط استعمال کر رہی تھی۔ لڑکے تو تعلیم مکمل کر کے اپنے اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور ایک وقت وہ بھی آیا جب دونوں لڑکے اچھے

عہدوں پر فائز ہو کر دوسرے شہر میں رہنے لگے۔ ایک بیٹی تھی وہ بھی چھوٹی لہٰذا والدین کے لاڈ پیار نے اسے اور بھی آزاد خیال بنا دیا۔ اب اسکول کی سرحد سے نکل کر کالج میں داخل ہو چکی تھی۔ اپنی خوبصورتی اور دولت کا رعب دکھا کر بہت جلد وہ کالج کے لڑکے لڑکیوں میں مقبول ہو گئی۔ نئے نئے فیشن کے ڈریس کوئی شبنم سے پہننا سیکھے۔ اس کی تراش خراش پر گھنٹوں درزی سے بحث کرتی۔ ایک بار تو شرافت علی کی نظر ایک ٹیلرنگ ہاؤس پر اچانک پڑ گئی جہاں شبنم کو کپڑے کی پیمائش کراتے دیکھ لیا ٹیلر بڑی سنجیدگی سے اس کے جسم کے زیر بم کو فیتے سے ہی نہیں نظروں سے بھی ناپ رہا تھا لیکن شبنم بے حس بنی کھڑی رہی شرافت علی خاموشی سے چلے آئے مگر اس کا ذہن پریشان تھا اس بات پر کہ وجاہت صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ انھیں شبنم کا یہ طریقہ ناگوار لگا اور انھوں نے گھر پہنچتے ہی چھوٹے بھائی وجاہت علی کو آواز دی۔

''وجاہت علی......وجاہت علی......''

''حاضر ہوا بھائی صاحب! کہتے ہوئے وجاہت علی کمرے میں پہنچ گئے۔

''کیا بات ہے بھائی جان؟ آپ کچھ ناراض سے دکھائی دے رہے ہیں؟''

''تمھیں میری ناراضگی دکھائی دے رہی ہے لیکن......''

''لیکن کیا بھائی جان......آپ بتائیں تو سہی'' وجاہت علی نے استفسار کیا۔

''وجاہت علی! تمھیں اپنی بچی کی آزادی دکھائی نہیں دے رہی ارے بھائی تعلیم حاصل کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ لڑکیاں حیا سے آزاد ہو کر دندناتی پھریں تم نے تو اسے سر چڑھا رکھا ہے۔

''بھائی جان......آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں اب وہ بچی نہیں رہی ماشاء اللہ ایم اے کر رہی ہے اور پھر زمانہ وہ نہیں رہا کہ بچیوں کو دربے میں بند کر کے رکھا جائے''

''یعنی ہماری بچی سرِ عام ٹیلرنگ ہاؤس میں کھڑی ہو کر جسم کی پیمائش کرائے اور تم کہتے ہو کہ بچی ہے۔ ہوش کے ناخن لو وجاہت علی'' وہ غصے میں کانپتے ہوئے بولے بھائی کی اس کیفیت کو دیکھ کر وجاہت علی بھی کچھ زچ ہوئے انھوں نے کہا ''بھائی جان اب آپ ہر چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہوں گے تو مشکل ہو گی۔ آپ تو بالکل دقیانوسی خیال کے ہیں۔ اب آپ کا ہمارا والا وقت نہیں رہا نیا زمانہ ہے نئی روشنی ہے اس میں یہ سب چلتا ہے''

’’زمانہ کوئی نیا یا پرانا نہیں ہوتا۔ ہم سب زمانہ کے معمار ہیں جیسا بچوں کو تعلیم دیں گے ویسا ہی معاشرہ تعمیر ہوگا۔ یہ جو فحاشی، فیشن لڑکے اور لڑکیوں کا اختلاط اسی کا نام نئی روشنی ہے تو پھر اندھیرا کسے کہتے ہیں؟‘‘

’’بھائی جان! ایک ہی تو بیٹی ہے میری اب اس پر دنیا بھر کی پابندی لگانا مناسب نہیں‘‘

’’وجاہت! تمھاری عقل کو کیا ہوگیا ہے؟ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ شبنم صرف تمھاری ہی بیٹی نہیں ہماری بھی کچھ لگتی ہے۔ بچوں کی طرف سے اس قسم کی بے حسی ایک دن تمھیں مہنگی پڑے گی‘‘ شرافت علی نے سمجھانے کی کوشش کی۔

’’بھائی جان! ایک چھوٹی سی بات کو آپ اس قدر طول دے رہے ہیں۔ ارے آپ کس کس پر پابندیاں لگائیں گے رہی بات فیشن اور گھومنے پھرنے کی تو یہی تو دن ہیں گھومنے پھرنے کے اور اپنی مرضی چلانے کے کل کو شادی ہو جائے گی تو پتہ نہیں کیسا گھر بار ملے کیسا شوہر ملے......‘‘

’’بات صرف فیشن کی نہیں، جس طرح کا لباس وہ زیب تن کرتی ہے تمھیں اچھا لگتا ہے تمھیں خبر بھی ہے کہ کالج کے بیشتر لڑکے اس کے دوست بنے ہوئے ہیں۔ بھلا ایک لڑکی کا لڑکوں سے دوستی کیا معنی؟ پھر تم نے موبائل بھی خرید کر دے رکھا ہے ہر وقت جب دیکھو وہ موبائل سے چپکی رہتی ہے۔ ان باتوں پر تمھارا دھیان نہیں جاتا‘‘ یہ بات جاری تھی کہ درمیان میں ہی شبنم کی ماں بول پڑیں ’’بھائی جان سو فی صد سچ کہہ رہے ہیں میں تو ان سے مجبور ہوں بار ہا میں نے کہا سیانی لڑکی ہے اسے یہ مردانہ لباس نہ پہناؤ کہ ستر ظاہر ہو۔ اللہ کے نبیؐ نے ایسے لوگوں پر لعنت فرمائی ہے۔ جو عورت ہو کر مردوں جیسا لباس پہنیں اور مرد ہو کر عورتوں سا مگر یہ میری ایک نہیں سنتے۔ کیا کروں بھائی صاحب اب تو حالت یہ ہے کہ وہ آج کل اپنے کمرے کے بجائے کھلے چھت پر سونے لگی ہے۔ میں تو ان باپ بیٹی سے پریشان ہوں‘‘

’’تم چپ رہو جی‘‘ وجاہت علی غصے سے بیوی پر برس پڑے ’’میری بیٹی ہے میں اس کا اچھا برا سمجھتا ہوں اور سب سے بڑی بات کہ مجھے اپنی بیٹی پر مکمل بھروسہ ہے۔ وہ کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھائے گی جس سے ہماری بدنامی ہو‘‘

’’ہاں...... ہاں...... چپ کر لو مجھے مرد ہونا...... دباؤ گے ہی لیکن میں بھی کہے دیتی

ہوں تمھاری یہ آزادی جو تم نے لاڈلی کو دے رکھی ہے پچھتانے پر مجبور کر دے گی۔ ناس ہو ان ٹیلی ویژن والوں اور سیریئل بنانے والوں کا خدا غارت کرے انھیں ہمیشہ ایسی کہانیاں ٹیلی کاسٹ کرتے ہیں کہ بال بچے خراب ہو رہے ہیں۔ سازش، دولت، حرص، حسد اور پھر قتل تک کے منظر پیش کرتے ہیں انھیں ہی دیکھ دیکھ کر بچے بچیاں بگڑ رہی ہیں''

''آج سے شبنم کا گھر سے بے وقت باہر جانا بند بھائی جان بالکل صحیح فرما رہے ہیں''

آسیہ بی زیادہ زبان نہ چلاؤ''

''اس میں زبان چلانے کی کیا بات ہے دلہن جو کہہ رہی ہیں درست ہے'' شرافت علی نے آسیہ بی کی حمایت کی لیکن وجاہت علی کو خفگی ہوئی بولے ''بھائی جان ہر آدمی کا اپنا لائف اسٹائل ہے اب شبنم کے جینے کا یہی طریقہ ہے اس میں آپ کو کیا قباحت ہے''

''میرے بھائی تم جسے قباحت کہہ رہے ہو وہ میرا خوف ہے خوف اس بات کا کہ ہر آدمی پر ماحول کا اثر پڑتا ہے میں نے بڑی محنت سے اپنے بچوں کو پالا ہے اور انھیں حق پر چلنے کا سبق دیا ہے اب ایسے میں گھر کی ایک بچی کا طور طریقہ مغربیت سے متاثر ہوگا تو میں کب تک اپنے بچوں کو اس شیطانی روش سے بچا سکوں گا میرے بچوں پر بھی اس کا برا اثر پڑے گا''

''تو میں کیا کروں شبنم کا گلا گھونٹ دوں؟ بھائی جان وہ ایم۔ اے کی طالبہ ہے ذہین ہے اور پھر ساری لڑکیاں ہیں اب رہی بات لڑکوں کی تو کالج میں تو دوستی ہوتی ہی ہے اس میں برائی کیا ہے؟'' وجاہت علی نے صفائی دی۔

''ٹھیک ہے پھر میں اپنے بچوں کو لے کر کسی دوسرے مکان میں منتقل ہو جاتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ میرے بچوں پر فحاشی، بے حیائی اور عریانیت کا سایہ بھی پڑے لیکن جانے سے پہلے ایک بات تمھیں بتائے دے رہا ہوں جس شبنم پر تم اتنا بھروسہ کرتے ہو اور جتنی غیر ضروری آزادی تم نے اس بچی کو دے رکھی ہے ایک دن تمھاری دی ہوئی آزادی تمھاری رسوائی اور ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے'' یہ کہتے ہوئے شرافت علی لوٹ گئے۔

کمرے میں وجاہت اور آسیہ بی بیٹی کے رشتہ کی بات کر رہے تھے اظہر علی صاحب کا لڑکا نہایت شریف اور تعلیم یافتہ ہے گھرانہ بھی ہماری برابری کا ہے لوگ بہت اچھے ہیں یہ رشتہ طے ہوا سمجھو'' ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شبنم بالکل چست جینس پینٹ اور بالکل مختصر ٹاپ

پہنے کمرے میں داخل ہوئی ''کس کے رشتہ کی بات ہو رہی ہے مما......؟''

آسیہ بی نے تیز نظروں سے گھورا۔ ''بیٹا شبنم یہ تم نے کتنا غیر شائستہ لباس پہن رکھا ہے۔ بھلا بتاؤ ایسا لباس پہننے کے باوجود تم بے لباس معلوم ہو رہی ہو۔ تمھیں غیرت نہیں آتی؟''

آسیہ بی نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''مما...... آپ تو بس ہر وقت اپنا لکچر دیتی رہتی ہیں۔ ایک چچا جانی سے نجات ملی تو اب آپ......'' کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

''سنتے ہو جی! میں تو کہتی ہوں جتنی جلدی ہو سکے اب اس لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دو۔ مجھے اس کے رنگ ڈھنگ ذرا اچھے نہیں لگتے۔ کل ہی اظہر علی صاحب سے بات کر کے تاریخ متعین کر لو'' آسیہ بی نے راز داری سے شوہر کو سمجھایا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو اچھا چلو اب آرام کرتے ہیں رات ہو رہی ہے صبح بھائی جان سے مشورہ کر کے دیکھتا ہوں''

اگلی صبح وجاہت علی اپنے بھائی کے گھر پہنچ گئے تمام باتیں بتائیں۔ شرافت علی نے کہا۔

''بھائی! اظہر علی کا خاندان تو بہت ہی اچھا ہے خاص بات یہ ہے کہ وہ لوگ دیندار بھی ہیں اب تم سوچو کہ ان لوگوں کا ہر کام سنت و شریعت پر ہوتا ہے اور ہماری بیٹی شبنم......؟ وہ تو بالکل ہی الٹرا موڈرن ہے کیا وہ وہاں خوش رہ پائے گی؟''

بھائی جان! خدشہ تو ہے مجھے لیکن پھر یہ سوچتا ہوں کہ ایسے لوگوں کے گھر جائے گی تو رفتہ رفتہ ذہن بدل جائے گا''

''ٹھیک ہے میں اپنے ذریعہ سے بات کرتا ہوں'' کہہ کر شرافت علی اپنے دفتر چلے گئے اور وجاہت علی اپنے کالج۔

....

''ہیلو...... ہیلو......'' ''اف یہ فون کیوں نہیں اٹھا رہا'' شبنم پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہی تھی ایک بار پھر اس نے نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ ''اف...... فار گوڈ سیک...... اٹھا بھی لو راشد'' وہ خود سے بڑبڑائی...... اچانک دوسری طرف سے آواز آئی ''کیا بات ہے؟ تمھیں

رات میں بھی نیند نہیں آتی ؟ گھڑی دیکھی ہے اس وقت رات کے دو بجے ہیں یہ کوئی وقت ہے فون کرنے کا؟'' راشد کی ناراضگی آواز سے ظاہر تھی۔

''نیند...... تمھیں نیند آ رہی ہے...... میری نیند اڑ چکی ہے تمھیں پتہ ہے کہ ممی پاپا میرا رشتہ طے کرنے والے ہیں اور تم گہری نیند سو رہے ہو؟'' وہ جھلائی۔

''شبو! میری اچھی شبو! مجھے اس وقت سونے دو کل صبح بیکرس ریستوراں میں ملتے ہیں وہیں بات کریں گے'' راشد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''واہ کیا اطمینان ہے یہاں میری جان پر بنی ہے اور تم کل بات کرو گے۔ ابھی وہ کچھ اور کہتی کہ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع ہوگیا۔ شبنم نے جھلا کر موبائل بستر پر پھینک دیا اور تکیے میں منھ چھپا کر رونے لگی۔

صبح ناشتے پر وجاہت علی آسیہ بیگم سب اکٹھے بیٹھے تھے کہ دروازے پر ہلچل ہوئی ناصر اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ بیٹے ،بہو اور پوتے کو دیکھ کر وجاہت علی اور ان کی بیگم بہت خوش ہوئے اور اب ڈرائنگ ہال میں سبھی اکٹھے ناشتہ کرنے لگے اسی درمیان آسیہ بی نے شبنم کے رشتہ کی بات چھیڑ دی ناصر اور اس کی بیوی نے بھی پسندیدگی ظاہر کردی۔ اتفاق رائے سے مسئلہ کا حل نکلتا نظر آ رہا تھا کہ اچانک شبنم نے سخت لہجے میں کہا۔

''ممی اور پاپا...... آپ لوگ کان کھول کر سن لیں میں وہاں شادی نہیں کروں گی'' اتنا سننا تھا کہ سبھی لوگ سکتے میں آگئے۔

''تمھارا دماغ تو نہیں خراب ہے...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو...... کبھی سوچا بھی ہے؟''

وجاہت علی غصے سے چیخے۔

''دیکھیے! میں بالغ ہوں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں کوئی گنوار لڑکی نہیں ہوں کہ گائے بیل کی طرح جس کھونٹے سے باندھ دیا وہیں بندھ جاؤں گی اور زندگی بھر جگالی کرتی رہوں''

''اے لڑکی! تیرے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟ تو کس سے بات کر رہی ہے وہ تیرے والد ہیں۔

''ہاں جانتی ہوں بتانے کی ضرورت نہیں، میں نے جو کہہ دیا بس کہہ دیا''

''یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے میری بہن'' بھائی ناصر نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''دیکھیے مسٹر ناصر! آپ میرے ذاتی معاملے میں دخل نہ ہی دیں تو اچھا ہے۔ اپنی دنیا

آباد کر کے خوش ہیں رہیے۔ میں اپنی زندگی کی مالک خود ہوں'' ناصر کے اٹھے ہوئے قدم وہیں رک گئے۔ وجاہت علی، آسیہ بی ناصر اور اس کی بیوی ایک دوسرے کا منھ تکتے رہ گئے۔

''شبنم بیٹے! یہ تم کو کیا ہو گیا ہے تم میرے لاڈ پیار، پرورش، اور تعلیم دلانے کا یہ صلہ دے رہی ہو'' وجاہت علی عاجزی سے بولے۔

''ہر باپ لاڈ پیار دیتا ہے سب کے والدین اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں آپ نے کوئی احسان مجھ پر نہیں کیا۔ اور سن لیجیے آپ اپنا فیصلہ مجھ پر زبردستی نہیں تھوپ سکتے۔ میں وہ لڑکی نہیں ہوں کہ سر پر آنچل ہر وقت سنبھالتی ہوئی جی امی اور جی پاپا کرتی رہوں گی۔ آخر میرے پڑھنے کا فائدہ ہی کیا کہ بے زبان جانور کی طرح ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل کر دی جاؤں'' وہ بولے جا رہی تھی اور سارے گھر کے لوگ سناٹے میں تھے۔

''آخر تو کیا چاہتی ہے...... اظہر علی صاحب کا اتنا اچھا گھرانہ ہے پڑھے لکھے لوگ ہیں صوم صلوٰۃ کے پابند ہیں لڑکا بذات خود انجینئر ہے کمی کیا ہے''

''کمی ہے کمی ہے مما...... اور وہ یہ ہے کہ میں اس سے پیار نہیں کرتی''

''پیار......؟؟ یہ پیار کہاں سے آ گیا...... میری بچی...... ارے شادی کے بعد شوہر و بیوی میں جو پیار ہوتا ہے وہ دیرپا ہوتا ہے اور مستحکم اس سے ایک گھر کی تعمیر ہوتی ہے ایک خاندان وجود میں آتا ہے تیری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اور......'' ''تو سن لیجیے میں راشد سے پیار کرتی ہوں اور اسی سے شادی کروں گی یہ میرا اٹل فیصلہ ہے''

''بہن یہ بات اچھی نہیں تم ابو اور امی کے لاڈ پیار کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو''

''میں نے کہا نہ آپ مت بولیے آپ سے کون مشورہ مانگ رہا ہے؟'' وہ چلّانے لگی تبھی وجاہت صاحب اٹھے اور ایک زوردار تھپڑ شبنم کو رسید کیا ''بے غیرت...... بدتمیز اسی دن کے لیے تجھے پال پوس کر، پڑھا لکھا کر بڑا کیا تھا کہ آج یہ دن دیکھنا ہوگا۔ تیری شادی اظہر علی کے لڑکے روشن ضمیر سے ہی ہوگی۔ تجھے اور کوئی نہ ملا کہ ایک چھٹے درجہ پاس لڑکے سے شادی کا خواب دیکھ رہی ہے کان کھول کر سن لے میری زندگی میں یہ رشتہ ناممکن ہے۔ ذرا اپنا اسٹیٹس دیکھ اور ان کا رہن سہن دیکھ میں معاشرے میں کیا منھ دکھاؤں گا'' بھائی جان ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میں نے کل ان کی بات نہیں مانی اور آج میں ان کا سامنا کرنے کے لائق نہیں۔ آسیہ اس سے کہو کہ میری نظروں

سے دور ہو جائے اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں اسے وراثت میں کوئی حق نہیں دوں گا'' وہ پسینے سے شرابور ہو گئے ناصر نے والد کو کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ گھر میں غم کا ماحول ہو گیا۔

اگلی صبح سارے شہر میں بجلی کی سرعت سے یہ خبر پھیل گئی کہ ماسٹر وجاہت علی اور ان کے تمام اہل خانہ کا بڑی بے دردی سے رات کے وقت قتل کر دیا گیا۔ ظالموں نے ان کے نو ماہ کے پوتے کا بھی گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ پولس کی تفتیش سے جو بات نکل کر آئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ قاتل کوئی اور نہیں بل کہ ماسٹر وجاہت علی کی اپنی لڑکی اور اس کا عاشق ہے۔

شرافت علی تیزی سے اٹھے اور باہر نکل گئے۔ جیل پہنچ کر انھوں نے شبنم سے ملاقات کی اور کہا ''کیا ملا تمھیں یہ سب کر کے؟'' ''تمھیں شرم نہ آئی۔ جس باپ نے اپنے سینے پر رکھ کر تمھیں سلایا، جس ماں کا دودھ پی کر تم پلی بڑھی جس کی ممتا کی چھاؤں میں تم نے اپنی ضد، ہٹ دھرمی، کے پودے کو تناور درخت بنا دیا۔ اسی کو تم نے اپنی...... خیر تم نے جو کیا اس پر تمھیں پچھتاوا ہو یا نہ ہو لیکن اتنا یاد رکھو، تمھاری دنیا بھی غارت ہوئی اور آخرت میں بھی تم سزاوار بن گئیں'' شرافت علی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے شبنم گم سم کھڑی صرف سنتی رہی۔

باہر نکلنے پر میڈیا پرسن نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ حسب، عادت سوالوں کی جھڑی لگا دی۔

''شرافت صاحب! شبنم آپ کی بھتیجی ہے کیا آپ بتائیں گے کہ اس نے اپنے ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کا قتل کن حالات میں کیا؟''

''آخر کیا وجہ تھی کہ شبنم نے یہ قدم اٹھایا اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔''

''کیا یہ سچ نہیں ہے کہ شبنم پر آپ کے بھائی ظلم کرتے تھے؟''

''شبنم کا کئی لڑکوں سے چکر تھا اس سلسلے میں آپ کا کیا کہنا ہے'' اسی طرح کے فضول سوالات میڈیا والے کرتے جا رہے تھے اور شرافت علی خاموشی کا لبادہ اوڑھے ان کے درمیان سے نکلنے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر وہ رک گئے اور سبھی میڈیا والوں سے مخاطب ہوئے۔

''دیکھیے برادر! آپ لوگ ایک ذمہ دار منصب پر فائز ہیں آپ کا بھی اپنا خاندان ضرور ہو گا۔ اگر ایسے ہی غیر اخلاقی سوال آپ سے کیے جائیں تو بتائیے آپ کا ردِ عمل کیا ہو گا؟ جہاں تک اس واردات کا تعلق ہے اگر آپ حقیقی معنی میں منصف دل رکھتے ہیں اور اپنے فرضِ منصبی کو

سچائی کے ساتھ نبھانا چاہتے ہیں تو آپ کے تمام سوالات کا میرے پاس جواب ہے وہ یہ کہ ''انسان خواہ کسی بھی مذہب یا دھرم کو مانتا ہو اگر اس کے دل سے خدا کا خوف، اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر اس دل میں شیطان اپنا ڈیرہ جما لیتا ہے اور جب شیطان ایسے دلوں کا مکیں بنتا ہے تو وسوسہ ڈالتا رہتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے صاف طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ ''شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے اس کی پیروی نہ کرو''، شبنم نے اخلاق کی تمام تر حدود کو پامال کیا ہے لہٰذا اسے تو اس کی سزا مل کر رہے گی اس دنیا میں بھی اور روزِ آخرت میں بھی۔ یہ سارا شاخسانہ آپ ہی لوگوں کی دین ہے اپنے اپنے چینلز پر فحاشی، عریانیت، بے راہ روی، غیر اخلاقی طور طریقے سیریلز اور اشتہارات کے ذریعہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ عام گھروں میں رہنے والی عوام اس کے برے اثرات سے بچ ہی نہیں سکتے۔ جیسا کہ شبنم کے کیس میں ہوا ہے بس میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کے تمام سوالات کا مثبت جواب میں دے چکا ہوں''

بھیڑ پر سناٹا طاری تھا اور شرافت علی تیز قدموں سے قبرستان کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

جُھک گیا آسمان

کال بیل کی آواز سن کر عرشی نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک آدمی کھڑا اسے بغور گھور رہا تھا۔

''کسے تلاش کر رہے ہیں'' عرشی نے دوبارہ سوال کیا وہ اجنبی اس سوال پر چونک پڑا۔ ...

''جی.... شہزاد صاحب ہیں....؟

''جی نہیں....!'' عرشی نے مختصر سا جواب دے کر دروازہ بند کرنا چاہا لیکن اجنبی نے دوبارہ دریافت کیا'' کہاں گئے ہیں؟''

''وہ اس وقت ہوا خوری کے لئے نکلے ہیں۔ آپ کون ہیں اور کیوں ان سے ملنا چاہتے ہیں؟'' عرشی نے تھوڑا گھبراہٹ میں اس اجنبی سے سوال کیا۔

دراصل میں ان کا پرانا ساتھی ہوں بلکہ یوں سمجھیے ہم ایک ہی دفتر میں م کرتے تھے۔ میں اب ریٹائر ہو چکا ہوں کافی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ آج آفس گیا تو پتہ چلا کہ آجکل وہ چھٹی پر ہیں، وہیں سے اس گھر کا پتہ چلا تو میں ملنے چلا آیا۔

''ابھی تو ان کے آنے میں وقت ہے'' عرشی نے اس اجنبی کو ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں میں انتظار کیے لیتا ہوں'' وہ لان میں رکھے چیئر پر جا بیٹھا اور آج کے اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

عرشی کو وہ اجنبی کچھ خبطی سا لگا۔ نہ جان نہ پہچان صبح صبح پتہ نہیں کون سر پھرا آ گیا دروازے پر دماغ خراب کرنے'' وہ بڑبڑاتی ہوئی دروازہ بند کر کے اندر کچن میں چلی گئی، وقت اور

حالات انسان کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ صادق بھی کسی زمانے میں ایک اونچے عہدہ پر فائز تھا' اس کا اپنا خوشحال خاندان تھا۔ بیوی ایک لڑکا اور بس۔ یوں سمجھئے بالکل سرکاری منصوبہ پر عمل پیرا تھا دنیا کی ہر خوشی اللہ نے عطا کی تھی۔ بیوی بھی ایک اسکول میں سرکاری ٹیچر تھی' بڑی اچھی طرح سے گھر کا کارخانہ چل رہا تھا۔ صادق اپنی مصروفیت کے باعث اکثر دفتر سے دیر سے آتا اور یہ بات اس کی بیوی کو قطعی پسند نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی صادق بالکل اس کا پامرید رہے کیونکہ وہ بھی سروس کرتی ہے وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہے کبھی کبھی یہ ملازمت دونوں کے درمیان ترشی کا سبب بن جاتا۔ آپس کے جھگڑے سے ان کا اکلوتا لڑکا ذہنی طور پر پریشان رہتا۔ لیکن صادق کی اہلیہ نے کبھی اس نازک مسئلے پر دھیان ہی نہیں دیا۔

ایک دن تو غضب ہی ہو گیا، جب صادق دفتر سے آئے تو ان کے ہاتھ میں ٹفن بکس تھا۔ اس کی بیوی نے دیکھا تو ہاتھ سے چھین لیا'' یہ ٹفن باکس کس کا ہے؟'' اور تم اسے کیوں لیے آرہے ہو؟''

'' بھئی بات یہ ہے کہ میرے ایک اسٹاف ہیں جن کی شریک حیات نے ان کے لئے لنچ بنا کر دیا تھا، لنچ پیریڈ میں انھوں نے مجھے بھی مدعو کیا کہ یہ پراٹھے آپ لیں لیکن میں نے معذرت چاہ لی کیونکہ میری خواہش نہیں تھی لہٰذا انہوں نے یہ کہا کہ آپ اسے گھر لے جائیں اور بھابھی کے ساتھ مل کر کھائیں گے اس لیے میں لیتا آیا'' صادق نے جواب دیا۔

'' ہوں... تو آجکل جناب دوسروں کی بیویوں کے بنائے ہوئے پراٹھے کھا رہے ہیں۔ وہ تیز ترش باتوں کے تیر برساتی رہی اور صادق بے چارہ اپنی تھکان کیا مٹاتا ذہنی کوفت میں مبتلا ہو گیا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ صادق کی بیوی کی بدمزاجی اپنی تمام حدود کو پار کر چکی تھی اور ایک دن اس کی زندگی میں وہ طوفان آیا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کسی بات سے ناراض ہو کر اس کی بیوی اپنے میکے چلی گئی۔ مہینہ گزر جانے کہ بعد بھی وہ واپس نہیں لوٹی، اس درمیان صادق کئی بار اپنی سسرال پہنچے اور بیوی کو سمجھایا مگر وہ ماننے کو تیار نہیں ہوئی، اسے یہ شک ہو گیا کہ کوئی دوسری عورت ہے جو دفتر میں اس کے لئے لنچ بھیجتی ہے اور صادق اس سے جھوٹ بول رہے

ہیں۔ بار ہا سمجھانے کے بعد بھی جب وہ نہ مانی تو مجبوراً اپنے خسر سے تمام باتیں سچ سچ بتادیں لیکن کوئی اثر نہ ہوا صادق مایوس ہوکر واپس لوٹ آیا۔ گھر میں اس کا بیٹا انتظار کررہا تھا۔ ماں کی غیر موجودگی کی خبر اسے بھی ہوگئی تھی۔ اس نے باپ کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ ۔ ۔ ۔

''پاپا! آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ کے ساتھ ہوں'' بیٹے کی یہ بات سن کر صادق کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے بیٹے کو سینے سے لگالیا۔

دفتر سے لوٹ کر جب صادق نے دروازہ کھولا تو گھر اسے کاٹے دوڑ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا گھر عورت سے ہی بنتا ہے، کیا ہوا میری بیوی اگر بدمزاج ہے لیکن گھر میں تو رونق تھی، میں پھر ایک بار اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں، دفعتاً کامران نے صادق کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھمادیا۔

''پاپا.... دوپہر میں ڈاکیہ لفافہ آپ کے نام دے گیا ہے۔ صادق نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ دھڑکتے دل سے اس نے لفافہ کھولا تحریر دیکھ کر اس کے پیروں سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی وہ کوئی خط نہیں بلکہ ثانیہ نے وکیل کے ذریعہ نوٹس بھیجا تھا وہ اس سے طلاق چاہتی ہے آخر کار وہی ہوا جو ثانیہ چاہتی تھی جھوٹے معاملے میں پھنسا کر اس نے صادق سے طلاق لے لی۔ مہر کے نام پر تمام بینک بیلنس اور مکان وغیرہ کورٹ کے ذریعہ اپنے نام کرالیا......ایک جھٹکے میں صادق کا بھراپرا گھر بکھر گیا۔ وہ اب سڑک پر آچکا تھا۔ اپنی اس حالت کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرسکتا تھا پھر پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔

ایک لمبے عرصے کے بعد اس شہر میں آیا تھا دفتر پہنچا جہاں وہ اپنے اسٹاف شہزاد سے ملنا چاہتا تھا جو اب سینئر افسر ہو چکے تھے لیکن دفتر کے لوگوں نے اسے اس گھر کا پتہ دے دیا جہاں وہ اس وقت تنہا لان میں بیٹھا اخبار کے اوراق الٹ پلٹ کررہا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری کہ شہزاد صاحب لان میں داخل ہوئے اس اجنبی کو دیکھ کر تھوڑا ٹھٹھک گئے صادق نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

''ارے شہزاد صاحب کافی دیر سے آپ کا انتظار کررہا ہوں۔ کہاں چلے گئے تھے آپ؟'' وہ ایک ہی سانس میں سارے سوال کرگیا۔ شہزاد اس اجنبی کی بے تکلفی پر حیرت زدہ تھے ''شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں'' صادق نے پھر ٹوکا۔ میں ہوں صادق کسی زمانے میں آپ کا

افسر تھا، خیر چھوڑیئے...... گزری باتوں کو......"

اتنا سننے کے بعد شہزاد کو یاد آیا۔ یہ وہی صادق صاحب ہیں جو میرے افسر تھے اور میں اکثر انہیں لنچ اپنے ساتھ کراتا تھا یکا یک شہزاد نے مصافحہ کے لیئے ہاتھ بڑھایا تب صادق کے جان میں جان آئی دونوں گفتگو میں محو تھے اسی درمیان شہزاد کی لڑکی رعنا بڑے کارڈ بورڈ پر اپنے بنائے ہوئے قدرتی مناظر دکھانے لگی جو اس نے کمپٹیشن کے لیئے تیار کیئے تھے۔

"یہ تو بہت خوبصورت بنایا ہے......" صادق نے سین دیکھتے ہوئے کہا' لیکن بیٹے ایک کمی ہے وہ یہ کہ غروب ہوتے سورج کی لالی کچھ ہلکی ہوگی۔ اسے تم درست کرلو انشاءاللہ تم فرسٹ آؤ گی۔ صادق کے تبصرے و مشورہ نے رعنا کو متاثر کیا اور وہ اس میں ترمیم کر کے اسکول چلی گئی۔ اسی درمیان چائے آئی دونوں نے چائے پی اور صادق اٹھ کر جانے لگے شہزاد نے انہیں روک لیا "نہیں صادق صاحب آپ میرے ساتھ ہی لنچ کریں گے" یہ سن کر شہزاد کی بیوی اندر اندر ناراض بھی ہوئی لیکن شوہر کے حکم نے انھیں باندھ دیا تھا...... بادل نخواستہ وہ ناشتہ بنانے چلی گییں۔ اسی مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی۔ شہزاد ایک بات نہیں سمجھ سکے کہ صادق کی ایسی حالت کیوں ہوگئی دبلا پتلا جسم دھنسی ہوئی آنکھیں شیو بڑھا ہوا۔ یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے تبھی اندر سے عرشی نے آواز دی "اجی سنتے ہو؟"

"کیا ہے......؟ شہزاد اٹھتے ہوئے بولے۔ اندر پہنچے تو عرشی نے کہا" یہ کون مصیبت لئے بیٹھے ہو چائے پلا کر ہی چلتا کیوں نہ کر دیا"۔

"عجیب باتیں کرتی ہو' یہ مہمان ہیں کبھی میرے افسر رہ چکے ہیں۔ اب انھیں اس طرح کیسے نکال دوں۔" شہزاد نے عرشی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو جی...... مجھے تو یہ آدمی بڑا چالاک لگ رہا ہے۔ حالت اس کی دیکھو کیسی ہونق جیسی ہے اور باتیں ہیں کہ مت پوچھو کہہ رہا ہے بیٹا شارجہ میں ہے کمپیوٹر انجینئر ہے۔ مجھے بلا رہا ہے' میں ایک ماہ میں اپنے بیٹے کے پاس چلا جاؤں گا' منہ نہ جانے صبح صبح کس کا منہ دیکھ کر اٹھی تھی: دیکھنا اب تھوڑی دیر میں کہے گا آپ کے پاس فون تو ہوگا ذرا ایک کال شارجہ کرلوں......؟

شہزاد بیوی کی باتیں سنتے ہوئے دوبارہ کمرے میں آ گئے۔ صادق بڑے غور سے کمروں

کا جائزہ لے رہا تھا" بڑی خوبصورت پینٹنگ ہے کس نے بنائی ہے؟" صادق نے سوال کیا۔" رعنا کو ہی پینٹنگ سے دلچسپی ہے وہی بناتی رہتی ہے۔" شہزاد جواب دیا۔ عرشی نے ناشتہ لگایا اور سبھی ناشتہ کرنے لگے۔

"ارے واہ...... کیا لذیذ پراٹھے ہیں بہت دنوں بعد بھابھی کے ہاتھ کا پراٹھا کھانا نصیب ہوا...... پرانی یاد تازہ ہوگئی"۔ صادق تعریفی جملہ بول رہے تھے لیکن عرشی کو یہ الفاظ بہت گراں گزر رہے تھے۔

"کھانے کے کیسے کیسے ہتھکنڈے ہوتے ہیں"۔ عرشی زیر لب بدبدائی۔ اچانک رعنا دوڑتی ہوئی آئی اور شہزاد سے لپٹ گئی۔" پاپا...... میں پینٹنگ میں فرسٹ آئی اور بتاؤں میرے اسی منظر پر زیادہ مارکس ملے جو انکل نے بتائے تھے" تھینک یو انکل" وہ صادق کا شکریہ ادا کرنے لگی، اور عرشی اس کی اس حرکت پر اندر ہی اندر گھٹی جا رہی تھی۔

ناشتہ تم ہو چکا تھا۔ صادق نے جانے کی تیاری کی لیکن تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ اس نے شہزاد سے پوچھا شہزاد صاحب......! اگر اجازت دیں تو میں ایک کال شارجہ کرلوں میرے بیٹے سے بات ہو جائے گی ویزا کے بارے میں معلوم ہو جائے گا"۔

شہزاد اس بات کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسے اپنی بیوی کی بات میں سچائی نظر آئی، یقیناً لوگ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو جاتے ہیں لیکن کیا کرتا۔ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ اجازت دیدی۔

"ہیلو...... کامران بیٹے...... وعلیکم السلام!

کیا کہا...... میرا ویزہ ایک دو روز میں مل جائے گا...... ٹھیک ہے اپنا خیال رکھنا، خدا حافظ۔ اور صادق نے فون کریڈل پر رکھ دیا۔

اس کے چہرے سے فکر کے نشان کم ہو چکے تھے مگر شہزاد کے چہرے پر اکتاہٹ کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے، وہ چاہ رہے تھے کے جلد سے جلد یہ بلا ٹلے۔ صادق نے مصافحہ کیا اور رخصت ہو گیا۔ شہزاد اور عرشی کی جان میں جان آئی۔

صادق کو گئے ایک ماہ کا وقفہ گزر گیا تھا شہزاد اور اس کا خاندان کھانے پر بیٹھے تھے کہ کال

بیل نے انھیں چونکا دیا۔ عرشی کے ماتھے پر پھر بل پڑ گیے۔ لگتا ہے پھر وہ تمھارے ہونق دوست کھانے کے وقت آدھمکے۔ وہ بڑ بڑاتی ہوئی خود ہی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے پر پوسٹ مین بڑا سا پارسل لئے کھڑا تھا ''شہزاد صاحب کے نام یہ پارسل ہے۔''

پارسل عرشی چونک گئی...... ''کہاں سے آیا ہے؟''

شارجہ سے کسی صادق صاحب نے بھیجا ہے''

پوسٹ مین کے جواب پر عرشی خاموش ہوگئی۔ شہزاد نے پارسل ریسیو کی' اور لے کر کمرے میں آیا۔ پارسل کھولا قیمتی ساڑیاں' فراک' سوٹ' بچوں کے لئے خوصورت تحفے اور شہزاد کے لئے خوبصورت سلیپنگ گاؤن' کھلونے اور ایک رنگوں کا بڑا باکس۔ سبھی لوگ قیمتی تحفے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ ایک خوبصورت بکس پر ایک خط لگا تھا۔ شہزاد نے جلدی سے اسے کھولا اور پڑھنے لگا۔ ڈیر شہزاد!

سلام خلوص!

حسب وعدہ میرے بیٹے کامران نے میرا ویزا بھیج دیا تھا۔ تمھارے یہاں سے آنے کے چند ہی دن بعد مجھے ویزہ مل گیا اور میں اپنی تمام یادوں کو سمیٹے یہاں اپنے لائق بیٹے کے پاس آ گیا ہوں۔

یہ پارسل تمہیں بھیج رہا ہوں۔ اس میں چند تحفے ہیں، ساڑی بھابھی کے لئے کیونکہ وہ نیلا رنگ پسند کرتی ہیں اور باقی چیزیں بچوں کے لئے ہیں۔ رعنا کے لئے میں نے خاص طور سے پینٹنگ کا سامان بھیجا ہے' اور جس باکس پر یہ خط لگا ہے اسے کھول کر دیکھو' تمہاری پسند کی رسٹ واچ ہے اور ساتھ میں ۲۸۰/- روپیہ کا ڈرافٹ ہے یہ اس ٹیلی فون کال کی فیس ہے جو میں نے تمہارے گھر سے شارجہ کیا تھا' اسے قبول کر لینا۔

تم لوگوں کی یاد بہت آتی ہے اور ساتھ ہی آتی ہے ثانیہ کی یاد' لیکن افسوس کہ وقت اسے بدل نہ سکا۔

تمہارا دوست

صادق

خط پڑھ کر شہزاد کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ عرشی شرمندہ ہو رہی تھی کہ اس نے وقت کے ستائے آدمی کے متعلق کتنی غلط باتیں سوچ رکھی تھیں' شہزاد کے لب تھرتھرا رہے تھے۔

''عرشی! وہ میرا دوست تھا۔ اسے میری ضرورت تھی، لیکن ہم نے اسے حقیر سمجھا جبکہ آج تمہیں بتاتا ہوں کے اس کی زندگی میں جو طوفان آیا تھا اس کا ذمہ دار میں ہوں، میں نے ہی تمہارے لنچ کو انہیں دے دیا اور اسی لنچ نے صادق کی بیوی کے دل میں شک کا بیج بو دیا۔ وہ یہ سمجھنے لگی کہ صادق صاحب کا کسی دوسری عورت سے رابطہ ہے اور یہ چھوٹی سی بات ایک گھر کو تباہ کر گئی ...... عرشی میرا دوست میرے پیار کا حقدار تھا' ہماری ہمدردی کا حقدار تھا اور ہم نے ......''۔

شہزاد انتہائی رنجیدہ اور شرمندہ سر تھام کر بیٹھ گیا...!

☆☆☆

خالی ہاتھ

بارات آنے میں تھوڑی دیر تھی، پورا گھر شادی کے ماحول میں ڈوبا ہوا تھا۔ در و دیوار سے خوشیاں جھلک رہی تھیں۔ مہمانوں کی آمد، نوجوان شوخ تتلیوں کے جھنڈ رنگ برنگے پنکھوں کو پھیلائے دلہن کے کمرے میں تو کبھی باہر بالکنی پر نمودار ہو رہی تھیں۔ اس انتظار میں کہ کب سپنوں کا شہزادہ سفید گھوڑے پر سوار آئے اور ان کی سہیلی کو ڈولی میں بٹھا کر لے جائے۔ پنڈال سے شہنائی کی آواز پورے ماحول کو یہ احساس دلا رہی تھی کہ آج ایک بیٹی بابل کے گھر سے رخصت ہونے والی ہے۔ ہر دل خوش لیکن ہر آنکھ نم۔ بارات آگئی۔ آج ظفیر خاں کی اکلوتی لڑکی کی شادی تھی، ظفیر خاں ایک متوسط گھرانے کے کھاتے پیتے فرد تھے۔ قلم کے مزدور، اپنی صلاحیتوں کے بل پر ایک اونچے عہدے پر فائز تھے لیکن اہم بات یہ تھی کہ بدلتے وقت کے مطابق ان کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ نیک طینت، منکسر المزاج، تکبر و غرور سے پاک ذہن۔ اپنے عہدے اور رتبے کا کوئی اثر ان پر نہ تھا۔ اور سب سے بڑی بات کہ ملازمت کے لمبے دور میں رشوت جیسے گناہ سے ان کا دامن پاک و صاف تھا۔ ایمانداری کی وہ مثال تھے جو آج کے دور میں عنقا ہے۔ اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق پورا انتظام کیا تھا۔

نکاح کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارا ہال مہمانوں سے بھرا تھا۔ مہمانوں کی خاطر میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ہر چہرے پر خوشیاں، ہر دل میں رشک۔ یکایک ماحول کشیدہ ہو گیا۔ خوشیوں کی شمع بجھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مہمانوں کے چہروں پر کھلی شوخیاں مایوسیوں میں بدلنے لگیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک کس کی نظر لگ گئی۔ ظفیر خاں خاموش کھڑے، ہونے والے داماد کا منھ

تک رہے تھے اور سمدھی کا چہرہ تنا ہوا تھا۔ ظفیر صاحب نے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی۔ ''بھائی صاحب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں......؟ میں نے تو صاف صاف بات آپ کو بتادی تھی، میں اس لائق نہیں ہوں۔

''ظفیر صاحب بات لائق کی نہیں سوال یہ ہے کہ ہمارا بھی کوئی اسٹیٹس ہے، سماج میں ہماری ایک خاص پہچان ہے اور آپ......''

''سمدھی صاحب جس اسٹیٹس کی آپ بات کررہے ہیں اس کا اعتراف ہے مجھے مگر......''

''مگر کیا...... ظفیر صاحب......؟ یہ مگر اور لیکن نہیں چلے گا۔ آپ کو ابھی اسی وقت چار لاکھ روپے نقد اور ایک مرسیڈیز کار دینی ہوگی۔ میرا لڑکا کوئی تعلیم یافتہ بے روزگار کے زمرے میں نہیں ہے، امریکہ کی ایک بڑی کمپنی میں جنرل منیجر ہے! میرا نہیں تو کم سے کم اپنے ہونے والے داماد کے عہدے کا تو خیال کیجیے...... آپ تو خود ایک اونچے عہدے کے بڑے افسر ہیں بھلا آپ کے پاس کمی ہی کیا ہے۔'' ریاست خاں نے اپنے خیال کا اظہار کردیا تھا۔

''اللہ کا شکر واحسان ہے۔ بے شک میں ایک بڑا اور ذمہ دار افسر ہوں لیکن میں وہ نہیں جو عام طور پر لوگ ہوتے ہیں۔ آپ کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور رہی بات لین دین کی تو زمانے کے چلن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر ایک چیز کا پورا خیال رکھا ہے آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔'' ظفیر صاحب نے سنجیدگی سے کہا، لیکن ریاست خاں ماننے کو تیار نہ تھے۔ ان کی کڑک دار آواز محفل کے سناٹے کو چیرتی ہوئی زنان خانہ تک جا پہنچی۔ عورتوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

خوشیوں کا سیلاب اچانک تھم گیا۔ ہر ایک چیز جیسے اپنی جگہ ساکت ہوگئی۔ ہال میں موجود باشعور مہمانوں نے ریاست خاں کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ اپنے ارادے پر اٹل رہے۔ پھر لوگوں نے ظفیر خاں کو بھی سمجھایا۔ ''اس وقت حالات کا تقاضہ ہے...... آپ مان لیں...... ورنہ معاشرہ میں بڑی رسوائی ہوگی یہ کوئی معمولی بات نہ ہوگی......''

''ٹھیک ہے اگر آپ سبھی لوگوں کی یہ خواہش ہے تو پھر ایک مجبور بیٹی کا باپ کیا کرسکتا ہے...... بیٹی کا باپ جو ہوں، جھکنا تو پڑے گا ہی۔'' وہ خود سے گویا تھے۔

اسی درمیان ایک نسوانی آواز فضا میں گونجی اور ماحول پر چھائے خاموشی کی چادر کو اڑا کر لے گئی...... ''کوئی ضرورت نہیں ہے...... آپ کو گڑگڑانے کی...... پاپا...... ان سفید پوش لالچی لوگوں سے صاف لفظوں میں کہہ دیں کہ میں روبینہ خانم ایسے گھٹیا لوگوں کے ساتھ اپنا رشتہ نہیں جوڑ سکتی۔ بہتر ہے کہ جتنا جلد ہو سکے یہاں سے دفع ہو جائیں۔''

دلہن کا فیصلہ سن کر ریاست خاں اور تمام باراتیوں کے پیر سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ کوئی لڑکی جس سے وہ اپنے لڑکے کی شادی کے لیے آئے تھے اتنے سخت جملے میں جواب دے گی۔ ہال میں موجود تمام مہمان دم بخود کھڑے تھے۔ خود ریاست خاں کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے ریاست خاں نے کہا...... ''بیٹی...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟''

''خاموش......! ایک لفظ بھی آپ کو بولنے کی نہ تو میں اجازت دوں گی نہ ہی آپ کا حق ہے۔ آپ کو جو کہنا تھا وہ آپ سر عام محفل میں کہہ چکے۔ محترم! میں ایک لڑکی ہوں۔ مال کے شوروم میں سجی ہوئی شے نہیں جس کا مول تول آپ کر رہے تھے۔ جن کے بازوؤں میں طاقت نہیں ہوتی اور جنھیں اللہ کی ذاتِ پاک پر بھروسہ نہیں ہوتا وہی لوگ دوسروں کی دولت پر حریص نگاہ رکھتے ہیں آپ بھی انھی میں سے ایک ہیں۔ جب آپ کے فرزند میں اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ اپنی زندگی کے ساتھی کی کفالت کر سکے اسے کیا حق ہے اس طرح مجمع لے کر کسی کے دروازے پر آجانے کا......؟ کون کہتا ہے کہ آپ بڑے آدمی ہیں، صاحب ثروت ہیں، دولت مند ہیں...... غلط...... بالکل غلط...... میری نگاہ میں شہر کا سب سے غریب ترین اور مفلس ترین شخص کوئی ہے تو وہ آپ ہیں اور آپ کا یہ فرزند...... تعجب ہے اتنا سننے کے بعد بھی اب تک یہاں کھڑے ہیں یہ بھی غیرت کی ہی بات ہے۔'' کہتے کہتے روبینہ پر غشی طاری ہونے لگی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ''پاپا......! آپ پریشان نہ ہوں...... اللہ نے جب پیدا کیا ہے تو انتظام بھی وہی کرے گا۔ آپ کی یہ بیٹی تعلیم یافتہ ہے۔ آپ ہی نے تو ہمیں سبق دیا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی میں قوم و ملت کی بیٹیوں کو پڑھاؤں گی، انھیں صحیح

فکر اور تربیت دوں گی اور اسی طرح زندگی گزارنا پسند کروں گی لیکن ریاست خان جیسے لالچی زر پرست، دوسروں کی دولت پر گدھ جیسی نظر رکھنے والے کے یہاں بیاہ کر نہیں جاؤں گی۔''

سہیلیوں نے اسے سنبھالا، ماں کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ پورے ماحول میں غم کی ردا پھیلی تھی۔ روبینہ کی سہیلیاں اسے لے کر کمرے کی طرف بڑھنے کو تھیں کہ ایک آواز ابھری۔ ''ٹھہریئے......!'' لوگوں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک سن رسیدہ شخص آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا ظفیر خاں کے قریب آیا۔

''ان حالات میں آپ کو میں نے آواز دی۔ اس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ ایک باپ کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی۔'' اس شخص نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ جو منظر نامہ ہمارے ریاست خاں صاحب نے پیش کیا ہے اس میں نہ ان کی غلطی ہے اور نہ آپ کی بلکہ اس معاشرہ کے پروردہ ہم خود ہیں ہم نے دوسروں کی دیکھا دیکھی نکاح جیسے متبرک رشتے کو مقابلہ جاتی امتحان بنا دیا ہے اور کوشش یہ کرنے لگے ہیں کہ لین دین کے معاملے میں کون کس سے زیادہ نمبر لے آتا ہے۔ تو نتیجہ ایسا ہی سامنے آتا ہے۔'' بات معقول تھی لوگوں کے سر ندامت سے جھکے ہوئے تھے۔ ظفیر خاں بغور اس اجنبی شخص کو دیکھ رہے تھے جو شاید مہمانوں میں سے ہی تھا۔ وہ ظفیر خاں کے قریب آیا اور پھر گویا ہوا۔

''محترم! میرا نام تردی خان ہے۔ ایک اجڑے گلشن کا مرجھایا ہوا پھول ہوں۔ آپ لوگوں جیسا اعلیٰ عہدیدار نہیں ہوں ہاں! اللہ نے اپنی نعمتوں سے ضرور نوازا ہے اس لیے اس کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔ زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں، ایک شریکِ حیات تھی جس کے دو پھول ہمارے حصے میں ملے۔ ایک کو اللہ کے کرم سے اس کے گھر پہنچا چکا ہوں اور وہ خوش حال ہے ایک میرا فرزند ہے آفندی خاں رئیس تو نہیں ہے لیکن اونچی تعلیم حاصل کر کے ایک سرکاری ملازم ہے...... بات کہنا چاہ رہا ہوں پر سمجھ نہیں پا رہا ہوں کیسے کہوں، بس یوں سمجھ لیجیے کہ اگر آپ ہمارے بیٹے کو اپنے لائق سمجھتے ہیں تو میری خوش قسمتی ہوگی۔ سچ یہ ہے کہ میں ریاست خاں کی دعوت پر باراتی کی حیثیت سے آپ کے دولت خانہ پر حاضر ہوا ہوں مگر مجھے یہ حرکت اچھی نہ لگی میں بھی ایک بیٹی کا باپ ہوں۔ حالات کی نزاکت سمجھ سکتا ہوں آگے آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔''

ظفیر خاں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ہونٹ فرطِ جذبات سے تھرتھرا رہے تھے اس سے قبل کہ وہ گر جاتے تردی خاں نے بازوؤں میں تھام لیا۔

ہال میں چہل پہل بڑھ گئی۔ خوشیاں لوٹ آئیں۔ باہر کی خبر اندرون زنان خانہ تک پہنچ گئی۔ سب نے اللہ کا شکر ادا کیا اور تھوڑی ہی دیر میں روبینہ خانم آفندی خان کی شریکِ حیات بن چکی تھی۔ تمام موجود مہمانوں نے نئے جوڑے کو دعائیں دیں! سبھی کے چہرے پر خوشیوں کی بہار جھوم رہی تھی لیکن اسی بھیڑ میں دو افراد ایسے تھے جو مغموم وہ پشیمان بے آبرو ہو کر محفل سے خالی ہاتھ لوٹ رہے تھے۔

☆☆☆

سنگ دل

رات کافی ہو چکی تھی، کالی گھٹاؤں سے آسمان ڈھکا تھا۔ رہ رہ کر بجلی کوند جاتی۔ دور تک بادلوں کے ٹکرانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اظہر کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے بے چین ہو گیا۔ آخر کار وہ کمرے میں ٹہلنے لگا یکایک بجلی چمکی اور گرج کے ساتھ چھینٹے پڑنے لگے ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کے پٹ کھل گئے اور بارش کی بوندوں نے اظہر کو بھگو دیا۔ جیسے جیسے بارش تیز ہو رہی تھی اظہر کا دل بھی دھڑک رہا تھا اسی درمیان اسے خیال آیا کہ بیٹھک میں خان بابا بیمار ہیں دوا تو دے چکا تھا پھر بھی انہیں دیکھنے کے لئے کمرے سے نکل کر بیٹھک میں جا پہنچا۔ ایک بہت ہی ضعیف شخص ایک جانب پلنگ پر لیٹے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ اظہر نے آواز دی ''خان بابا...... خان بابا ایک نحیف آواز پلنگ سے ابھری ''جی بیٹے! اب تک تم جاگ رہے ہو۔ بیٹے رات کافی ہو چکی ہے اب سو جاؤ۔ ویسے تم اپنے کام میں اتنا مصروف رہتے ہو اس کے بعد مجھ لاچار کی تیمارداری'' ابھی جملہ پورا بھی نہ ہوتا تھا کہ اظہر نے خان بابا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''نہیں خان بابا...... ایسا نہ کہیں گزشتہ تین سالوں میں والد کی طرح شفقت و محبت کا خزانہ لٹا رہے ہیں۔ آپ جیسی گرانقدر شخصیت اللہ نے مجھے عطا کر دی یہ تو میری خوش قسمتی ہے۔''

بیٹے خوش قسمت تو میں ہوں کہ عمر کے اس موڑ پر اللہ نے بہتر ٹھکانہ عطا کیا ورنہ......'' اور خان بابا کی آنکھیں چھلک آئیں، ہونٹ تھرتھرائے پر وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ اظہر نے انہیں تسلی دی خان بابا نے ٹھنڈی سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ بجلی اب بھی چمک رہی تھی اور بارش پورے شباب پر تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ خان بابا کے دکھوں پر وہ بھی رو رہا ہے۔ اظہر اپنے کمرے میں

آ چکا تھا۔اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ خان بابا کے متعلق سوچ رہا تھا۔اتنی بڑی دنیا میں کون ان کا سہارا ہوتا۔ جب ایک بم بلاسٹ میں وہ زخمی حالت میں سڑک پر کراہ رہے تھے انکا چہرہ اس قدر جھلس گیا تھا کہ پہچان کرنا مشکل تھا۔کاندھے پر ایک چھوٹا ایئر بیگ تھا جو جسم سے لگا ہوا تھا۔اتفاقاً میرا گزر اسی راستے سے ہوا حالات کی نزاکت اور انسانی ہمدی کے تحت میں نے انہیں ہسپتال پہنچادیا اور فون کر کے اپنی بیوی زینت کو اسپتال میں ہی بلوالیا۔چہرے پر پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔زخم گہرا تھا۔کافی دنوں بعد زخم تو اچھے ہو گئے لیکن ان کا چہرہ بالکل مسخ ہو چکا تھا۔بات چیت سے ایسا محسوس ہوا کہ وقت وحالات نے انہیں اس مقام پر کھڑا کر دیا ہے اس طرح وہ گھر کے حصہ بن گئے۔ان کی شفقت محبت نے ہمیں اپنا گرویدہ بنالیا۔زینت انہیں خان بابا اور بچے خان دادو پکارنے لگے۔بجلی ایک بار پھر کڑکی زوردار آواز سے سارا شہر دہل گیا۔اظہر بھی خیالوں کے تانے بانے سے آزاد ہو گیا۔بارش کے سبب بجلی گل تھی۔ وہ قدم بڑھاتا ہوا اپنے بستر پر آ کر دراز ہو گیا۔سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کیں۔ اسی لمحہ اس کا ذہن ماضی کے اوراق میں کھو گیا۔جب میں چھوٹا تھا والدین کی شفقت ے زیر سایہ پرورش ہو رہی تھی اور وقت کا خاموش پرندہ اپنے پنکھوں پر دن ماہ سال کو سمیٹے رواں تھا۔ میں اب بڑا ہو چکا تھا۔اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میرے آگے پڑھنے کی پلاننگ کی جارہی تھی۔اسی درمیان والد ووالدہ کے درمیان اختلافات نے ایک دوسرے کو دور کر دیا میں نے والدہ کو ترجیح دی۔اختلافات کا سبب جانے بغیر والد سے کجی رکھ لی لیکن اس عمل کی محرک میری والدہ تھیں۔میری اس کج ادائی پر والد صاحب نے صرف اتنا کہا تھا۔تمہاری عقل پر نادانی کا پرتو چڑھا ہے وقت کی گرمی جب اسے پگھلا دے گی اور حقیقت آشکار ہو گی تو کف افسو ملتے رہ جاؤ گے۔سوچتا ہوں کیا اسی دن کے لئے تمہیں پالا تھا پھر وہ ہم سے دور چلے گئے کہاں ؟ کسی کو نہیں معلوم نہ ہم نے تلاش کیا۔وقت اپنے رفتار سے رواں دواں تھا میں ایم۔بی۔اے کے آخر سال میں تھا جب شہر میں فساد پھوٹ پڑا اللہ کا کرم کہ میں محفوظ رہا۔ایک دن مجھے ڈاکیہ نے ایک لفافہ دیا میں نے کھول کر دیکھا تو پہچاننے میں دیر نہ لگی میرے والد کی تحریر تھی جس میں انہوں نے اپنے ذہنی کرب اور دِلی پریشانی کا ذکر کیا تھا۔ میری درازئی عمر کی دعا دی تھی۔وہ مجھ سے ملنے آنے والے تھے لیکن اسی لمحہ پرانی باتیں شدت سے میرے ذہن میں آ گئی اور میں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ میں نے ایک چبھتا جملہ جواب میں

لکھ بھیجا کہ وہ چاہ کر بھی مجھ سے ملنے نہ آسکیں۔ بیس سال کا ایک لمبا عرصہ گزر گیا والدہ نے میری شادی کر دی اس موقع پر میرے دل نے والد کی کمی کو محسوس کیا والدہ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی لیکن انہوں نے دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دے ڈالی لہٰذا میں خاموش ہو گیا۔ حالانکہ دل سے ملنے کا خواہشمند تھا نفرت کے ریگستان میں جذبات کی رو نے نخلستان تو بنایا لیکن گرم آندھیوں نے جلد ہی اسے خشک کر دیا۔ ہماری پھلواری میں دو ننھے پھول کھلے رمشا اور علی۔ بھاگ دوڑ کی زندگی نے میرے احساس پر وقت کی دھول جما دی۔ پھر بھی ذرات کے پس منظر سے ایک چہرہ ہمیشہ جھانکتا رہا۔ وہ مجبور آنکھیں جو اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے ترستی ہوں گی۔ نہ جانے وہ کہاں ہوں گے کس حالت میں ہوں گے۔ ان کی یاد اب ایک چبھن کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ بارش نے زور پکڑ لیا تھا یکا یک بادل کی گرج نے خیالوں کا تسلسل توڑ دیا۔ اظہر ماضی کے گلیارے سے نکل کر حال میں داخل ہو چکا تھا۔ اسے بیٹھک سے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے بیٹھک میں پہنچا خان بابا بستر کے نیچے گرے تھے اور اٹھنے کی کوشش میں تھے۔ دوا کی شیشیاں دور لڑھک گئی تھیں پانی کا گلاس بھی گرا ہوا تھا جس کے سبب خان بابا کے کپڑے گیلے ہو گئے تھے' اظہر نے سہارا دے کر انہیں اٹھایا۔ ''خان بابا آپ مجھے آواز دے لیتے۔'' ''نہیں بیٹے تمہیں تکلیف دینا میرا مقصد کبھی نہیں رہا'' ''اب یہ بوڑھی ہڈیاں بھی بے وفا ہو رہی ہیں۔'' ''خان بابا۔ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ میں جو ہوں'' خان بابا کی سانس تیز تیز چل رہی تھی بخار سے پورا جسم تپ رہا تھا۔ اظہر نے انہیں بستر پر لٹا دیا۔ اور ڈاکٹر کو آنے کی اطلاع دی۔ ''کہاں گئے تھے' بیٹے اظہر!'' ڈاکٹر کو فون کرنے آپ کو بخار بہت تیز ہے۔'' ''بیٹے! میری بیٹی زینت پوتے علی اور پوتی رمشا کو بلا دو۔ ان کمزور ہوتی آنکھوں کو انہیں کا انتظار ہے۔''

''آپ گھبرائیں نہیں وہ لوگ کل آجائیں گے میں نے فون کر دیا ہے۔'' ''اللہ تمہیں شاد و آباد رکھے۔''

''خان بابا! اگر برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں۔'' ''پوچھو...... کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ میں نے تمام زندگی کسی کی بات کا برا نہیں مانا۔'' ''آپ کے کوئی بچے نہیں ہیں......؟'' اظہر کے اس سوال پر ٹوٹتی سانس کی جیسے کڑیاں جڑ گئیں۔ ایک لمحہ کے لئے وہ خاموش اظہر کے چہرے کو غور

سے دیکھتے رہے۔ پھر نزدیک بلا کر کہا ''کیا تم میرے بیٹے نہیں ہو؟'' سوال کے جواب میں یہ سوال! اظہر کے دل کو دھکا لگا۔ اسے اپنے والد کی یاد آ گئی۔ ''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں آپ ہی کا تو بیٹا ہوں۔'' جواب سن کر خان بابا کی بوڑھی آنکھیں آنسوؤں کا سیل رواں برداشت نہ کر سکیں اور چھلک گئیں۔ فرط جذبات سے انہوں نے اظہر کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اظہر بھی آبدیدہ ہو گیا۔

صبح ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے جانچ کر کے بتایا کہ پھیپھڑے خراب ہو چکے ہیں ریکوری مشکل ہے۔ اب صرف اللہ ہی انہیں شفا دے سکتا ہے۔ یہ دوائیں محض مریض کی تشفی کے لئے دی ہیں۔ اظہر کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔ اس کے منہ سے گھٹی سی آواز نکلی۔ ڈاکٹر......؟''

''مسٹر اظہر اب آپ یہ کریں کہ مریض کی جو خواہش ہو اسے پوری کرنے کی کوشش کریں۔'' اظہر کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ خان بابا کے پھیپھڑے خراب ہیں۔ وہ اب چند دنوں کے مہمان ہیں وہ ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اسے اپنے والد کی یاد پھر آنے لگی۔ پتا نہیں میرے والد کا کیا حال ہو گا وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر بچوں کا شور سنائی دیا۔ زینت خان بابا کی علالت کا سن کر واپس آ گئی تھی

''خان بابا...... خان بابا'' اس نے آواز دی۔ ''کون......؟'' ایک نحیف آواز ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ ''میں ہوں' زینت۔ آپ کی بیٹی۔''

''اچھا...... زینت...... بیٹے تم آ گئیں اور میرے علی ورمشا کہاں ہیں؟'' وہ بہت مشکل سے بول رہے تھے۔ دونوں آپ کے سامنے ہیں'' زینت نے دونوں بچوں کو خان بابا کے پلنگ کے نزدیک کر دیا۔ ''میرے بچو! تمہیں دیکھنے کو ہی یہ آنکھیں منتظر تھی۔ دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خان بابا نے شفقت جتائی۔ اچھا کیا تم آ گئیں تمہارے ہی انتظار میں رکا تھا اب میں سکون سے اپنے گھر جا سکوں گا''

''نہیں بابا...... آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ یہیں رہیں گے ہمارے ساتھ' ان بچوں کے ساتھ۔ وہ سسکنے لگی۔ بیٹے! ذرا اظہر کو بلاؤ۔ اور تم سبھی یہیں رہوں میرے پاس۔ میں اپنی نظروں سے سب کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ ''بیٹا اظہر......! اب تمہارا یہ خان بابا رخصت چاہتا ہے اس مدت میں اگر ضعیف خدا کے بندے سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اظہر نے رندھے گلے سے کہا۔ ''ارے پگلے میرا ٹکٹ کنفرم ہو چکا ہے ٹرین بھی آیا ہی چاہتی ہے اور ہاں علی و رمشا اپنے خان دادو کی ایک بات یاد رکھنا ہمیشہ اپنے امی ابو دونوں کی عزت کرنا۔ میرے بچو! والدین بچو کے لئے بڑی دولت ہوتے ہیں۔''

''بیٹی زینت !ادھر آؤ۔'' زینت خان بابا کے قریب ہوگئی انہوں نے ایک چھوٹا ائیر بیگ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا یہ میری زندگی کی کل پونجی ہے اسے رکھ لو اس میں کچھ اہم چیزیں ہیں جو میں اپنے بیٹے کے لئے لایا تھا۔ بیٹے اظہر! اس دنیا میں جو لوگ قافلے کے ساتھ نہیں چلتے وہ راستے کی بھیڑ میں کھو جاتے ہیں۔'' وہ دھیرے دھیرے بولتے جا رہے تھے۔ ''اظہر تم نے ایک باپ کی خالی جھولی پیار سے بھر دی۔''

''نہیں خان بابا...... آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ میں...... میں تو خود اپنے والد کو دیکھنے کی تمنا میں جی رہا ہوں والدہ کی بدمزاجی سے تنگ آ کر میرے والد الگ ہو گئے اور وہ خود بھی مجھے تنہا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں اور میں اکیلا رہ گیا۔ کہتے کہتے وہ رونے لگا۔ خان بابا کی سانس اکھڑ رہی تھیں۔ زینت نے ڈاکٹر کو فون کیا...... لیکن وہ ڈاکٹر کے آنے کا انتظار نہیں کر سکے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور چلی گئی۔

خان بابا اب اس دنیا میں نہیں تھے اب ان کی یادیں ہی رہ گئیں۔ بیٹھک کو صاف ستھرا کرنے کے دوران ایک ڈائری ملی جس پر قلم رکھا تھا۔ زینت ڈائری کے صفحات کو الٹ پلٹ کر پڑھنے لگی۔ تحریر کیا تھی احساسات کا ایک بیکراں سمندر تھا۔ درد والم کا ایک آبشار تھا جو روشنائی بن کر صفحات پر نقش ہو گیا تھا۔ ایک صفحہ پر لکھا تھا۔ ''اس دنیا میں جو لوگ قافلے کے ساتھ نہیں چلتے وہ راستے کی بھیڑ میں کھو جاتے ہیں' گزرتے وقت نے میرے خد و خال اس قدر بدل دئے کہ آئینہ کو سامنے رکھتے ہی اپنی ہی صورت سے ڈر جاتا ہوں۔ چلو اچھا ہوا میں ایک تناور درخت تھا لیکن میری واحد شاخ کو کاٹ کر مجھ سے الگ کر دیا گیا۔ بہت تکلیف ہوئی تھی لیکن بے زبان مخلوق کی طرح خاموش وقت و حالات کے آگے سرنگوں ہو گیا۔ میں تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن تمہاری تحریر ایک تجربہ تھا تمہیں شاید یاد نہ ہو لیکن تمہارا بھیجا ہوا پوسٹ کارڈ آج بھی میرے اس بیگ میں موجود ہے ان جملوں کا عکس ان بوڑھی اور کمزور ہوتی آنکھوں میں قید ہے میں تم تک نہیں پہنچ سکا۔ تمہاری اس تحریر کو جتنی بار میں نے پڑھا اتنی بار میں نے خود کو قتل ہوتا محسوس کیا۔ آج بھی سمجھنے سے قاصر

ہوں کہ تم نے مجھے ملنے سے کیوں روکا؟ بیٹا تمہارا یہ باپ تو بہت پہلے مر چکا لیکن خدا کے دیئے اس رشتہ کو کاندھے پر اٹھائے ایک زندہ لاش کی طرح چلتا رہا۔ میں راستے میں تھا کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا پھر مجھے کچھ معلوم نہیں ہوش آیا تو میرے سامنے بیٹی زینت کھڑی تھی۔ میں وہاں سے جانا چاہتا تھا مگر اس نے یہ کہہ کر تسلی دی کہ اس کے شوہر بہت اچھے ہیں ابھی وہ دوا لانے گئے ہیں ان سے آپ مل لیں پھر چلے جانا۔ میں رک گیا جب تم آئے اور میں نے تمہیں دیکھا تو آنکھوں کو یقین نہ ہوا...... یہ تو میرا اظہر ہے۔ میرا اپنا خون۔ میری وہ شاخ جو کبھی مجھ سے کٹ گئی تھی۔ فرق یہ تھا کہ وہ دو پیارے بچوں کا باپ بن چکا ہے۔ شفقت پدری نے اکسایا کہ بتادوں میں تمہارا ابو ہوں مگر انجانے خوف نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ دل نے کہا نہیں سرتاج خان تمہاری منزل مل گئی۔ اب یہ غلطی نہ کرنا کہ اپنا نام ظاہر کردو ورنہ...... میں کانپ گیا۔ میری شکل وصورت پر دیسے بھی وقت کی دھول پڑ چکی تھی اور تم مجھے نہ پہچان سکے۔ اس طرح اپنے ہی بچوں کے درمیان خان بابا بنا رہا۔ ممکن ہے جب تک یہ سطور تم تک پہنچے میں زندگی کی مسافت طے کر چکا ہوں گا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں نے تمہاری تمام خطاؤں کو معاف کر دیا۔ تم نے ایک باپ کی خالی جھولی پیار سے بھر دی ہے اللہ بھی معاف کرنے والا کریم ہے۔"

سرتاج خاں

تحریر پڑھ کر زینت کے آنسو نکل گئے۔ تھکے قدموں سے وہ کمرے میں آئی اور ڈائری اظہر کو دکھانا چاہ رہی تھی لیکن وہ حیران رہ گئی کہ اظہر کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں اور اظہر نے کانپتے ہاتھوں سے ایک پرانا پوسٹ کارڈ زینت کی طرف بڑھا دیا۔ جس پر انگریزی میں تحریر تھا۔

please;please;please,dont,come to me.if you will came here I feel uncomfortable that will not to be good for you and me.ok?!! اور کمرے میں سسکیوں کی آوازیں تیز ہوگئیں بازگشت میں وہی آواز گونج رہی تھی تمہاری عقل پر نادانی کا پرتو چڑھا ہے وقت کی گرمی جب اسے پگھلا دے گی اور حقیقت آشکار ہوگی اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی۔"!!

☆☆☆

سرابِ تمنّا

ٹرین نے وسل دی میں دوڑ کر اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اپنی برتھ پر بیٹھنے والا ہی تھا کہ میرے جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی اور اندر ہی اندر جیسے مفلوج ہونے لگا۔ مجھے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ ماہنامہ "بتول" جسے میں نے راستے میں پڑھنے کے لیے خریدا تھا وہ نیچے گر چکا تھا۔ میں نے جھینپتے ہوئے ماہنامہ بتول اٹھایا اور خاموشی سے اداریہ پر نظریں مرکوز کر دی۔ لیکن کبھی کبھی لوگوں سے نظریں بچا کر سامنے بیٹھے مسافر کو بھی دیکھ لیتا۔ بالکل وہی شکل وصورت کوئی فرق نہیں۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی تو میری نظر مرتضٰی ساحل کے اداریہ پر دوبارہ سرکنے لگی۔ حالانکہ نگاہ اداریہ پر تھی لیکن ذہن میں ایک جنگ کا سا ماحول تھا۔ ہاں اور نہیں کے درمیان شک کی سوئی جو گھوم رہی تھی وہ حقیقت میں تبدیل ہوگئی جب بازو میں بیٹھے شخص نے اسے آواز دی۔

"شبنم! یہ ہریالی کتنی دلکش ہے۔" وہ باہر کے منظر سے لطف اندوز ہوتا ہوا بول رہا تھا۔ یہ شبنم تھی اب بھی اپنے نام کی طرح ٹھنڈی لیکن اندر سے پتھر وہی خصلت کوئی تبدیلی نہیں۔ نظر سے غرور وتکبر جھلک رہا تھا حالانکہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا لیکن خاموش تھی۔ کتنا فرق ہے اس کی زبان، چہرے اور فطرت میں۔ میں رسالہ پر نظریں جمائے رہا مگر میرا دل اچاٹ ہو رہا تھا۔ ذہن کی دہلیز پر ماضی کے طوفانی جھونکوں نے دستک دی ایک ایک کر کے تمام دروازوں سے واقعات جھانکنے لگے۔ میرے ذہن کے پردے پر وہ منظر پھر گھوم گیا "کیا آپ بھی فائنل ایئر کا فارم بھر رہے ہیں" اس نے بڑی ناز وادا سے پوچھا تھا۔

''جی ہاں!'' میں نے مختصر سا جواب دیا تھا۔

''اگر آپ کو دشواری نہ ہو تو میرا بھی فارم جمع کر دیں'' بھیڑ کافی تھی شاید اسی لیے اس نے میرا سہارا لیا تھا۔ لمبی قطار میں کھڑے کھڑے دھکے کھاتا رہا کسی طرح میں نے اس سے فیس اور فارم لیا اس قدر بھیڑ میں بھی میری نظر اس کا ایک لمحے کے لیے طواف کر گئی۔ سراپا جیسے شاعر کا تخیل، چھریرا بدن۔ گندمی رنگ پتلے ہونٹ۔ جھیل جیسی آنکھیں جن میں کوئی بھی اپنا وجود غرق ہوتا محسوس کرے۔ آسمانی رنگ کے سوٹ میں وہ بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ فارم جمع کرنے کے بعد رسید اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ رسید لے کر وہ تیزی سے چلی گئی میں صرف خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

کچھ دنوں بعد پرنس کیفے میں اس پر میری نظر پڑی شاید اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ ''ہیلو مسٹر؟'' سرفراز میں نے اپنا نام بتایا اور وہ جھینپ گئی۔

''میں شرمندہ ہوں اس دن آپ کا شکریہ ادا نہ کر سکی ذرا جلدی میں تھی''

''کوئی بات نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے'' میں نے تسلی دی، میری نظر اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھی۔ محسوس یہ ہو رہا تھا جیسے کوئی انجانا لمس مل گیا ہو۔ میں نے ویٹر کو مزید کافی کا آرڈر دیا۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھی تھی۔

''اچھا یہ بتائیں کہ میں آپ کو کس نام سے پکاروں'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''مطلب......؟'' اس کی بھنویں تن گئیں۔

''ناراض نہ ہوں......میرا مطلب ہے آپ کا نام کیا ہے؟''

''اوہ......تو آپ میرا نام جاننا چاہتے ہیں؟''

''جی''

''شبنم''

''شب......نم......یعنی بھیگی رات۔'' میں نے مذاق کیا اس کے چہرے پر بھی شوخ آثار نمودار ہوئے۔ کافی ختم کرنے کے بعد ہم باہر آ گئے۔

''آپ کہاں جائیں گی؟''میں نے اخلاقاً پوچھا۔

''راجندر نگر ریلوے کالونی۔''

میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور شبنم کو اس کے گھر چھوڑتا ہوا یوں ہی گھومتا رہا۔ کبھی گاندھی میدان، کبھی فریزر روڈ، کبھی بورنگ روڈ تو کبھی بیلی روڈ، میں انجانے میں شبنم کی طرف متاثر ہو رہا تھا۔ خوشی کا ان چھوا احساس موجیں مار رہا تھا۔ رات کے دس بجے گھر پہنچا۔ اسکوٹر نوشاد کو لوٹا دیا۔ روم کے سبھی پارٹنر خراٹے بھر رہے تھے اور میں شبنم کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ نہ جانے کب نیند نے اپنے آغوش میں لے لیا۔

شبنم مجھ سے بہت قریب ہو چکی تھی میں اس کے حسن کے شبنمی اجالوں میں بھٹک رہا تھا۔ ہر شام پرنس کیفے، موریہ کمپلیکس اور پٹنہ کالج کے عقب میں گنگا کے کنارے ملتے اور پہروں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ ایک دن اسی طرح انجینئر نگ کالج کے پیچھے گاندھی گھاٹ پر بیٹھے میں غروب ہوتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ شبنم بھی پاس بیٹھی گنگا کی مچلتی لہروں سے بادصبا کی اٹھکھیلیوں کا لطف لے رہی تھی۔ ڈوبتی کرنوں کی زردی اس کے رخسار پر پڑ رہی تھی جس سے اس کا حسن اور نکھر گیا۔ میرا ہاتھ اس کی انگلیوں سے کھیل رہا تھا۔

''شبنم''

''کیا ہے سرفراز؟''

''یہ لمحات کتنے خوشگوار ہیں شہر کے ہنگاموں سے دور کتنا سکون ہے۔''

''وہ تو ہے لیکن مجھے تو اس دن کا انتظار ہے جب تم ہمیشہ کے لیے میرے ہو جاؤ گے پھر یہ خوبصورت لمحے ہماری قید میں ہوں گے۔''

''انسان کو چند ملاقات میں سمجھنا مشکل ہے کوئی فیصلہ جلد بازی میں کرنا مناسب نہیں۔''

''میں نے سب سوچ لیا ہے۔''وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''کیا کمی ہے تم میں، ذہین ہو، اسمارٹ ہو، ارشد کو دیکھو بالکل پھٹیچر وہ بھی نام کی مناسبت سے مٹی کا مادھو ہی ہے۔ رہی بات تمھاری تو تمھارے پاس تو سب کچھ ہے۔ دولت،

عزت اور ذہانت مجھے اور کیا چاہیے۔'' ایک سانس میں وہ سب کچھ کہہ گئی جسے سننے کو میرے کان تیار نہ تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ میں شبنم سے پیار نہیں کر رہا ہوں بلکہ پانی پر لکیر کھینچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں ایک متوسط گھرانے کا لڑکا تھا۔ کالج کی زندگی میں خود کو ضم کرنے کے لیے چند اچھے لباس اور جیب خرچ ٹیوشن دے کر حاصل کر لیتا تھا۔ شبنم کی باتوں سے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ مجھ سے نہیں دولت سے پیار کرتی ہے۔ شاید میرے رکھ رکھاؤ سے اسے غلط فہمی تھی کہ میں کوئی دولتمند باپ کا بیٹا ہوں۔ شبنم کی نظریں حریص تھیں اس کا ذہن ان نمائشی کپڑوں اور جھوٹی شان وشوکت سے لپٹا ہوا تھا۔ جسے میں اپنے دوستوں کی مدد سے اپنی حقیقت چھپانے کے لیے کالج میں استعمال کرتا تھا۔ شبنم کے طریقہ سے غرور اور تکبر کی بو آرہی تھی۔ میری زبان پر ہزاروں اوس کے قطرے جم گئے۔

دن کے اجالے پر رات کی سیاہی چھا گئی تھی۔ شبنم بڑے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

''کیوں سرفراز خاموش کیوں ہو......؟'' اس نے سوال کیا۔

''کیا میری بات پسند نہیں آئی؟''

''شبنم انسان کسے اپنائے اور کسے ٹھکرائے میں اب تک نہیں سمجھ سکا۔''

رات کافی بیت چکی تھی میں شش و پنج میں رہا۔ خیال آیا کیوں نہ شبنم کو حقیقت سے آگاہ کردوں کہ وہ میں نہیں جو مجھے وہ سمجھ رہی ہے۔ ذہن اور ضمیر کی جنگ میں ضمیر کو فتح ملی میں نے فیصلہ کر لیا کہ شبنم کو حقیقت بتادوں گا۔ گزشتہ رات کی بے چینی میرے چہرے پر صاف جھلک رہی تھی۔ میں کالج کے لان میں بیٹھا شبنم کا انتظار کر رہا تھا لیکن جب وہ دور سے آتی دکھائی دی تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ پاس آتے ہی اس نے سوال کا پہلا تیر پھینکا۔

''آج آپ تنہا یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''شبنم!'' آدمی زندگی میں بہت سے حسین خواب دیکھتا ہے وہ سبھی حقیقت بن جائیں تو خواب کی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔ اکثر انسان سے بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور ہم اسے چھوٹا سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شاید ہم نے بھی ایک غلطی کی ہے۔''

’’آج تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ کسی فلسفی کی طرح باتیں کر رہے ہو؟‘‘ اس نے ٹوکا۔

’’میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو ایک متوسط گھرانے کا غریب آدمی ہوں میری پہنچ تمھاری تخیل کی پرواز تک نہیں۔‘‘

میں بولتا رہا اور شبنم کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدل رہا تھا۔

’’سرفراز! مذاق چھوڑو۔ مجھے ایسی باتیں پسند نہیں۔ سمجھے!‘‘

’’میں مذاق نہیں کر رہا ہوں یہ حقیقت ہے۔ ہم آپس میں اچھے ہم جماعت ہو سکتے ہیں لیکن......‘‘

’’لیکن کیا......؟ یہ کیا قصہ لے کر بیٹھ گئے۔ میں نے تمھیں اپنے دل میں جگہ دی ہے تمھیں پسند کیا ہے اور ہاں آج تک جو میں نے چاہا ہے اسے حاصل کر کے رہی ہوں۔‘‘

شبنم نے میری باتوں کا ذرا بھی دھیان نہیں دیا میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

’’شبنم سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمھارے اور میرے درمیان ایک بڑی خلیج ہے جسے ہم دونوں میں سے کوئی پاٹ نہیں سکتا۔ ضروری نہیں کہ چاہت کسی رشتے میں ہی بندھے۔ چاہت لا محدود ہے۔ محبت ایک احساس کا نام ہے۔ جسے محسوس کیا جا سکتا ہے اسے کوئی نام نہ ہی دیا جائے تو ہم دونوں کے لیے اچھا ہے۔ میں محسوس کر سکتا ہوں کہ میں تمھارے اور تمھارے خاندان کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔‘‘ میرے اتنا کہنے پر وہ جھلا گئی بھنویں تن گئیں بے ساختہ اس کے منھ سے نکلا......

’’ہوں......تو آپ بھی سڑی نالی کے گندے کیڑے ہی نکلے۔‘‘ اس نے حقارت آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

تمھاری نظروں میں کسی غریب کی کوئی عزت نہیں وہ صرف حسین خواب دیکھنے کی عادی ہیں۔‘‘

میں نے سمجھانے کی کوشش کی ایک کرخت آواز فضا میں گونج گئی۔

’’چپ رہو بدتمیز...... تمھارے جیسے لوگوں کے نام بھی ہمارے گھر میں نہیں لیے

جاتے‘‘ میں خاموش تھا وقت نے میرے ہاتھ اور زبان دونوں کو باندھ دیا تھا۔ اس دن کے بعد شبنم نے مجھ سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ وہ اب کالج کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ نظر آنے لگی۔ میں ان لڑکوں کے مستقبل کے متعلق سوچ کر کانپ اٹھتا تھا۔

امتحان میں کامیابی کے بعد کچھ دن تک تلاش معاش میں لگا رہا خوش قسمتی اور محنت کے سہارے ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز ہو گیا۔ لیکن شبنم کے جانے کے بعد زندگی میں پھر کوئی لڑکی نہیں آئی۔ آج پانچ سال بعد ٹرین میں یہ ملاقات محض اتفاق ہی ہے۔ ایک جھٹکے سے گاڑی آؤٹر سگنل پر رکی اور خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

اب بھی اس کے چہرے پر کبر و غرور کا پرتو جھلک رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹرین پلیٹ فارم پر آ لگی۔ میں ایک جانب تیزی سے بڑھنے لگا جہاں کافی بھیڑ تھی۔ ایکسائز ڈپارٹمنٹ کے کئی افسران نے مجھ پر نظر پڑتے ہی سیلوٹ کیا۔

’’کیا بات ہے انسپکٹر، یہ بھیڑ کیسی ہے؟‘‘ میں نے دریافت کیا۔

’’سر! یہی ہیں وہ لوگ جن کے بارے میں خفیہ جانکاری پر ان کی تلاشی لی گئی۔ اور یہ دیکھیے ہیروئن اور کوکین کے پیکٹ ان کے سامان سے ملے ہیں‘‘ اس نے مجھے دکھاتے ہوئے بتایا۔ شبنم اور اس کا شوہر سر جھکائے بت بنے کھڑے تھے۔

’’یو آر انڈر اریسٹ (آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے)‘‘ میں نے ایک اچٹتی نظر شبنم پر ڈالی۔ وہ شرمندہ حالت میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

’’مسٹر شرما انھیں لے جایئے۔‘‘ میرے حکم پر انھیں لے جایا گیا۔ شبنم اور اس کا شوہر پولیس حراست میں اپنی منزل کی جانب چل پڑے لیکن میرے کانوں میں شبنم کا وہ فقرہ گونج رہا تھا ’’تمھارے جیسے لوگوں کے نام بھی ہمارے گھر میں نہیں لیے جاتے۔‘‘

☆☆☆

شرمندگی

طویل عرصہ گزر جانے کے بعد آخر کار اس کے آقا نے ویزا دے دیا۔ آج اس کی دعائیں قبول ہو گئیں وہ مخصوص پروانۂ سفر کے ذریعہ دنیا کے کسی بھی خطے میں بے روک ٹوک جاسکتا تھا۔ مگر اس نے سب سے پہلے جس سرزمین پر قدم رکھا وہاں کی حالت کچھ عجیب تھی، انسانی شکل گاہے بگاہے ہی نظر آتی۔ شہر کیا تھا ملبے کا ڈھیر انھیں اوبڑ کھابڑ راستوں سے لوگ چلتے ہوئے اپنے مسکن کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ ترقی کی کوئی نشانی نہ تھی۔ اسکول تھے طالب علم ندارد، بازار موجود تھے لیکن گاہک یا دوکاندار کا اتہ پتہ نہیں۔ مکان بھی تھے کچھ جلے ہوئے تو کچھ منہدم۔ جو لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ان کے چہرے سہمے ہوئے تھے بار بار ان کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی زبان میں چیخ چیخ کر نہ جانے کیا کہہ رہے تھے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ یہ منظر دیکھ کر کچھ مایوس ہوا تبھی لوگوں کا ہجوم ادھر ادھر بھاگتا ہوا نظر آیا کچھ لوگ زمین پر لیٹ گئے کچھ مکانوں اور دیوار کے ملبے میں دبک گئے۔ آسمان پر جدید ڈائنا سور پروازیں بھرتے شہر کو ڈھک چکے تھے تھوڑی ہی دیر میں فضا دھوئیں سے پر ہو گئی علاقہ شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ چیخیں کراہیں آہ وبکا سے فضا گونجنے لگی۔ انسانی لاشوں کے ٹکڑے رہ رہ کر فضا میں بکھر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ یہ کیا منظر دیکھ رہا ہے۔ دھوئیں کے بادل اب چھٹ چکے تھے۔ ماحول میں خاموشی تھی۔ گہرا سکوت، باقی بچے لوگ بھی مٹی کے ڈھیر میں دب کر اپنا وجود کھو چکے تھے۔ اچانک ایک جانب سے جدید کار گو لباس میں فوجوں کی ٹولیاں نمودار ہوئیں

جن کے رنگ سرخ اور سپیدی مائل تھے ہاتھوں میں تلواروں کی جگہ لوہے کے بھاری بھر کم جدید ہتھیار تھے ذرہ بکتر کی جگہ مخصوص قسم کا لباس زیب تن کیے تھے۔ آنکھیں بھی کالے قسم کی شیشوں سے ڈھکی ہوئی تھیں بڑے محتاط ہو کر آگے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ڈائنا سور نے اپنا پنکھ سمیٹ کر زمین پر قدم رکھ دیا ہے اور اپنے شکار کی بو سونگھتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اسی لمحہ ایک دلدوز منظر سامنے تھا ایک عورت تقریباً دس سالہ اپنے بچے کو ان خونی پنجوں سے بچانے کے لیے دوڑ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ بچہ قابو میں آتا۔ دھائیں...... کی ایک آواز گونجی اور وہ غش کھا کر زمین بوس ہو گیا اس کے پیٹ اور سینے سے خون کی دھار پھوٹ پڑی۔ ماں نے جب یہ منظر دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اس کا معصوم بیٹا زمین پر خون میں لت پت پڑا شدت تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ اس نے زخمی بچے کو بچانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ وہی فوجی بندوقیں لٹکائے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ بچے کے قریب پہنچے اور فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے تھوڑی دیر تک وہ اپنے شکار کو غور سے تکتے رہے پھر ٹھوکروں سے الٹ پلٹ کر خود کو مطمئن کیا۔ ان کے چہرے رحم اور خلوص جیسے جذبوں سے عاری تھے اسی لمحہ اس کی ماں نے اپنے مردہ بیٹے کو گود میں اٹھایا۔ اس کا سراپا خون سے تر ہو چکا تھا۔ معصوم جسم سے بہتے خون کو اپنے چہرے پر مل کر زور سے چلائی۔ آواز سن کر وہ فوجی مڑے اس سے قبل کہ وہ دل برداشتہ ماں تک پہنچتے اس ماں نے چیخ کر کہا ''آؤ بش میرے بیٹے کے خون کو پٹرول میں بدل لو'' فوجی تھوڑی دیر تک خاموش رہے پھر واپس ہو گئے۔ وہ سوچ رہا تھا یہ کس مقام پر آ گیا؟ اس کا دل گھبرانے لگا لیکن وہ کافی جدوجہد کے بعد اپنے آقا سے ویزا لے کر آیا تھا لیکن اس منظر نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ وہاں سے چل دیا کسی اور جانب راستے میں اسے پہاڑ ملے جن پر درخت تو تھے لیکن پتے ندارد تھکان سے اس کا جسم چور چور تھا وہ غسل کرنا چاہتا تھا شاید کوئی ندی مل جائے ندیاں تو مل گئیں لیکن آلودگی بھری ان میں پانی کم اور خون زیادہ نظر آ رہا تھا۔''

راہ میں چند لوگ دکھائی پڑے جو اسے حیرت و استعجاب سے دیکھ رہے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں نفرت صاف جھلک رہی تھی کیونکہ اس کا رنگ بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ ان ظالم و بے رحم

فوجیوں کا وہ شرمندہ نظریں بچا کر اس سرزمین سے دور نکل گیا کسی اور منزل کی طرف جہاں یہ منظر نہ ہوں۔ جہاں انسان انسان کا شکار نہ کرتا ہو۔ جہاں اپنی طاقت اور صنعت کے ارتقاء کے لیے دوسروں کا عرصہ حیات تنگ نہ کیا جاتا ہو۔ اپنے لوگوں کو خوشحال بنانے کے لیے دوسروں کی زمین پر غاصبانہ قبضہ نہ کیا جاتا ہو۔

وہ اس سرزمین سے بہت دور نکل چکا تھا ویزا کی مدت بھی کم رہ گئی تھی اسے پھر اپنے آقا کے پاس واپس جانا تھا۔ اس لیے وہ کم عرصے میں لمبا سفر طے کر رہا تھا۔ اسی دوران اس کا قیام ایک ایسی سرزمین پر ہوا جو کوہ ہمالیہ اور ہندوکش کے پہاڑی سلسلوں سے گھرا تھا جہاں پہنچنے کے لیے درۂ خیبر کا لمبا پہاڑی راستہ تھا۔ اس سرزمین نے کبھی غلامی نہیں دیکھی جہاں اپنے گھر آئے مہمانوں کی تواضع ان کی تہذیب کا حصہ رہی جہاں قدرت نے سمندر سے دور رکھا لیکن میوہ جات کے خوشنما باغ عطا کیے۔ یہاں کے باشندے اس دور میں بھی امن و آزادی کے ساتھ رہے جب ایک حکمراں کے دور میں کہتے ہیں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ خواہش ہوئی ایسی پر امن سرزمین اور ان کے مکیں کو دیکھنے کی...... لیکن ...... یہ کیا......؟ وہی منظر...... وہی لاشیں وہی آسمانوں میں اڑتے جدید قوی ہیکل ڈائنا سور اور اوپر سے برساتے ہوئے آگ کے پٹارے ٹینکوں کی دھاڑ دھاڑ گولوں کے گھن گرج انسانی جسموں کے چیتھڑے فضا میں اڑتے میوہ جات کے درخت کوئلہ بن گئے۔ گولیوں اور راکٹوں کی آوازیں اللہ اکبر کی فلک شگاف نعرے ماحول کو ہیبت زدہ بنا رہے تھے۔ جدید ڈائنا سور آسمان کی بلندی سے آگ کے اولے برسا رہے تھے۔ اور پل بھر میں پہاڑ روئی کے گالے کی طرح ریزہ ریزہ ہو جاتے قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ وہ سوچنے لگا میں کہاں آ گیا ان انسانوں کو کیا ہو گیا آدم کی اولاد تو بھائی بھائی ہیں پھر یہ ہولناکی، یہ شدت، یہ برہمی کیسی؟ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ فوجی بوٹوں کی کڑکدار آواز نے چونکا دیا اس سے پہلے کہ وہ فرار ہوتا یا چھپتا وہ گورے فوجیوں کے محاصرے میں تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ گھبرایا لیکن فوراً ہی اسے اطمینان ہو گیا کیونکہ فوجیوں کے لباس پر اس نے گولڈن روڈ کا نشان دیکھ لیا تھا۔ وہ پہلو بدلتا کہ ایک سخت آواز نے سوال کیا۔

''تم یہاں کے باشندے تو نہیں لگتے سچ سچ بتاؤ کہاں سے آئے ہو؟''

''یہ غیر ضروری سوال ہے؟ تم یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟''

دوسرے فوجی نے سوال کیا۔ ''تم یہاں کس طرح آ گئے اس سرزمین کا رابطہ تو سب سے ہم نے کاٹ دیا ہے۔''

''میرے پاس میرے آقا کا مخصوص ویزا ہے اس لیے میں کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ مجھے تم کیا کوئی نہیں روک سکتا مگر یہ تو بتاؤ تم لوگ بھی تو یہاں کے باشندے نہیں لگتے پھر تم یہاں یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ یہ قتل و غارتگری، یہ بے قصور لوگوں کی خون میں ڈوبی لاشیں، یہ سب کس لیے؟''

''ہاہا...... ہاہا...... بے وقوف یہ ہم خود تھوڑے ہی کر رہے ہیں یہ بھی ہمارے آقا کا حکم ہے'' ایک فوجی نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''تمھارا آقا...... کون ہے تمھارا آقا...... کیا وہ انسان نہیں کوئی الگ مخلوق ہے جو انسانوں کا گوشت کھانے اور خون چاٹنے کا عادی ہے؟''

''ہم سب سات سمندر پار سے آئے ہیں اور دنیا کو دہشت گردی سے پاک کر کے امن کا پیغام دینا چاہتے ہیں یہی ہمارے آقا کا منصوبہ ہے''

''یہ تم امن لانے کے طریقہ کار پر عمل کر رہے ہو تعجب ہے دہشت گردی کو ختم کرنے کی بات کرتے ہو اور خود دہشت گردی کر رہے ہو بھلا آگ سے آگ بجھ سکتی ہے؟''

''ہاں بجھ سکتی ہے۔ دیکھو اس طرف ہم نے ان ملکوں کو ایٹمی ہتھیاروں سے نیست و نابود کر ڈالا۔ ان کے مکانات کو کھنڈر میں تبدیل کر دیے ان کی آبادیوں کو آگ کے دریا میں ڈبو دیا اب نہ آبادی رہے گی نہ دہشت گردی''

''لیکن یہ تو سراسر ظلم ہے''

''تمھاری نظر میں ظلم ہو سکتا ہے ہماری نظر میں یہی آزادی ہے ہمارا آقا دنیا کو مٹھی میں

کرنا چاہتا ہے اوراس کے لیے ہم کوئی بھی فیصلہ کرنے کو آزاد ہیں۔''

وہ خاموش ان فوجیوں کی آنکھوں میں تشدد کے آثار دیکھ رہا تھا اسی لمحہ ایک کرخت آواز نے اسے چونکا دیا شاید فوجوں کی ٹکڑی کا سردار تھا۔

''اے بڈھے! بہت دیر سے تیری بکواس سن رہا ہوں۔ بتا تو کون ہے اور یہاں کس لیے آیا ہے۔ جلدی بتا ورنہ ابھی تیرا کام تمام کر کے اسی جھاڑی میں پھینک دوں گا''

''اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور گویا ہوا۔ میں اپنے گھر سے صدیوں پہلے نکلا تھا ایک ایسے ملک کی تلاش میں جہاں سنتے تھے کہ ڈال ڈال پر سونے کی چڑیاں بسیرا کرتی ہیں۔ ایسی دنیا کی کھوج جہاں قدرت کا ہر خواب تعبیر بنا ہو۔ فطرت جس پر اتراتی ہو۔ جو جنت نشان ہو اسی کی تلاش میں سمندری لہروں کے تھپیڑے سہے طوفانوں کا سامنا کیا منجدھاروں سے زور آزمائی کی سفر کی صعوبتوں کو جھیلا دل میں ایک خواہش کی چاہت نے ہر دکھ برداشت کیا تا کہ ایک دن وہ دنیا پا جاؤں گا جس کی مجھے تلاش ہے ایک خدا کے بندے نے اپنی زبان میں یوں بھی کہا تھا......

ہوں جو تیار تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

امیدوں کا دامن تھامے ہوئے کالی راتوں چادر کاٹتے تیز اور تند ہواؤں کا مقابلہ کرتے کرتے میرے بازو شل ہونے لگے اچانک میری کشتی ایک ساحل سے ٹکرائی تو حد نگاہ تک جھاڑی (Bush) ہی جھاڑی پھیلی تھی۔ دور دور تک کسی آدم زاد کا نشان نہ تھا۔ شاید قدرت نے اسی لیے مجھے وہاں بھیجا تھا کہ وہاں میں گلزار بناؤں پھر دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کی بستیاں آباد ہوئیں وہ میرے دیرینہ خواب کی تعبیر بن گیا دنیا کو ایک نئی دنیا ملی شاعر کا کلام بھی سچ ہو گیا۔ بڑا نام ہوا اس سرزمین کا لوگ اس کی ترقی پر رشک کرنے لگے۔ رشک جنت، امن کا پیغامبر جمہوریت کا سردار بہت خوش ہوا تھا میں وہ سب کچھ دیکھ کر...... لیکن...... صدیاں گزرنے کے بعد لوٹا ہوں تو منظر بدلا بدلا سا ہے۔ یہ میرا گلستان نہیں ہے۔ میں نے ایسی زمین کے لیے لہروں کا

مقابلہ نہیں کیا تھا۔ یہاں تو اب جنگل سا وحشی پن ہے۔ اور (Bush) جھاڑی ہی جھاڑی ہے۔ اس جھاڑی میں دنیا بھر کے انسانوں کے دامن الجھ رہے ہیں۔ امن پسند انسانوں کے چہرے لہو میں ڈوبے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں یہ سوچ کر کہ کیوں اپنے گھر سے نکلا تھا۔ مجھے سونے کی چڑیا والا دیس کے بجائے یہ جھاڑیوں والا خطہ کیوں مل گیا...... میں شرمندہ ہوں ہاں میں شرمندہ ہوں اپنے آپ سے میرا نام جاننا چاہتے ہو تو سنو...... میں...... میں کرسٹو فر کولمبس ہوں!!

☆☆☆

شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ

جی ٹی روڈ کے کنارے عرصہ دراز سے قائم چھوٹے بڑے کھوکھے دنگائیوں نے نذر آتش کر دیے۔ جرنیلی سڑک کے دونوں کنارے پر اٹھتے ہوئے شعلوں کی لپٹ کسی برقی قمقمے کا منظر پیش کر رہے تھے۔ جینے کے سبھی ساز وسامان خاکستر ہو چکے تھے۔ جہاں انسانوں کا سیلاب امڈتا تھا۔ جہاں ٹرکوں کی لمبی قطاریں ہمہ وقت لگی ہوتی تھیں۔ جہاں ہر لمحہ کسی خوفناک حادثہ کی خبر کا اندیشہ ہوتا تھا۔ اس وقت وہ علاقہ فسادیوں کے ننگے رقص کا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ رات کے سائے میں محلّوں اور گلیاروں سے گولیوں کی آوازیں اور بموں کے دھماکے کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے۔ شہر کے لوگ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے محفوظ مقامات کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ عجیب سی افراتفری تھی۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی فرقہ وارانہ فساد دیکھا تو نہیں تھا۔ ہاں... فساد کے متعلق سن ضرور رکھا تھا۔ وہ سوچتا کہ آخر کیا ہو جاتا ہے لوگوں کو، برسوں سے ایک ساتھ رہنے والے، ایک دوسرے کے خوشی وغم میں شریک ہونے والے۔ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے والوں کے درمیان آخر کیا چیز ہوتی ہے جو ان گہرے اور مضبوط رشتوں کے درمیان شکوک کی لمبی لکیر کھینچ دیتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں؟ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جب یہ طوفان تھمتا ہوگا کالی رات کے قتل کے بعد نوید صبح جب آتی ہوگی تو لوگ ایک دوسرے سے کس طرح نظریں ملاتے ہونگے؟ ہونہہ نہ جانے کیا ہو جاتا ہے ان بے وقوفوں کو۔ وہ اپنے آپ بڑابڑایا۔ تبھی اس کی بیٹی نے اسے جھنجھوڑ دیا ''پاپا چلو جلدی کرو۔'' سارے محلے والے جا چکے ہیں۔'' ''ایں... ہاں....'' وہ یکا یک چونک پڑا۔ اس کے کانوں میں ایک خصوص آواز

بازگشت کرنے لگی...... ہر ہر مہادیو...... ہر...... ہر...... مہادونعرۂ تکبیر...... اللہ اکبرنعرۂ تکبیر...... اللہ اکبر۔اس عمر میں پہلی بار یہ احساس ہورہا تھا کہ یہی ہے فساد...... اور وہ تیزی سے اپنے اہل خاندان کو لے کر کسی محفوظ علاقے کی جانب بڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔بیوی نے کمروں میں تالا لگایا۔ایک بڑے تھیلے میں روزمرہ استعمال ہونے والے کپڑے اور ضروریات کا کچھ سامان رکھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پورا گھر ایسا ہوگیا جیسے یہاں انسان بستے ہی نہیں۔گڑیا، سلیمہ، رحمت، فرزاد ساجد سبھی نے جلدی جلدی اپنے کپڑے تبدیل کیے۔

سلیمہ...... او سلیمہ...... ارے بھائی جلدی کرو......''

''آئی ممی...... سلیمہ نے آواز لگائی۔

''ساجد ذرا دیکھو تو وہ کمبخت کیا کررہی ہے۔یہ سبھی کو ذبح کرائے گی۔'' آسیہ بی ناراض ہوتے ہوئے بولیں۔

''لو...... میں آگئی۔'' سلیمہ نے کہا۔

''اتنی دیر سے تو کر کیا رہی تھی؟ آسیہ بی نے گھور کر پوچھا......

''اپنے کھلونوں کے بکس کو ترتیب دے رہی تھی ممی'' ساجد نے فوراً ٹوکا۔''نہیں ممی میں نے کھلونے نہیں لیے بس انھیں محفوظ کر کے رکھ دیا ہے جب لوٹوں گی تو کھیلوں گی۔'' سلیمہ کی معصومیت نے آسیہ بی کو نرم کردیا۔

''ہر...... ہر...... مہادیو......''

نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی آوازیں نزدیک آنے لگیں۔

''جلدی کرو...... سب نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما عقیل نے صدر دروازے پر تالا ڈالا اور رات کے اندھیرے میں اللہ کے سہارے نکل پڑے۔پتلی پتلی گلیوں سے ہوکر بچتے، چھپتے چلے جارہے تھے کہ کسی طرح اپنے بچوں کو لے کر کلکٹر کی کالونی پہنچ جاؤں جہاں عقیل کے بھائی طفیل اپنے خاندان کے ساتھ مقیم تھے۔وہ علاقہ محفوظ بھی تھا اور فساد کی آگ وہاں تک نہیں پہنچی

تھی۔ طفیل عقیل کے چھوٹے بھائی تھے لیکن اللہ نے انھیں اپنی رحمتوں سے نوازا تھا۔ اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ان کے پاس تھا۔ دولت، کوٹھی کار...... یوں کہہ لیجیے کہ تمام مادی سہولیات مہیا تھیں لیکن دل خوفِ خدا سے خالی تھا۔ دولت کا نشہ نہ صرف ان پر بلکہ بیوی بچوں پر بھی سوار تھا۔ بیوی بچوں پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز تھا۔ یہ دولت ان کے اپنے محنت کی کمائی نہ تھی وہ تو عیاری سے بڑے بھائی کا حق مار کر حاصل ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ شہر سے باہر ایک پاش کالونی میں اپنا مکان بنا کر رہ رہے تھے۔ اس مصیبت کے حالات میں انسان ان تمام باتوں کو بھول جاتا ہے اور خون کے رشتے جوش مارنے لگتے ہیں۔ یہی سوچ کر عقیل بھی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ جلد سے جلد وہاں پہنچنا چاہ رہا تھا۔ بچے بھی پر امید تھے۔ لیکن...... اس سے پہلے کہ وہ وہاں تک پہنچ پاتے جرنیلی سڑک پر پہنچتے ہی وہاں کے منظر نے عقیل کو مایوس کر دیا۔ بچے آگے جانے کو تیار نہیں تھے۔ بیوی بھی رونے لگیں۔ عقیل نے ہمت بندھائی۔ دیکھو...... راستہ سنسان ہے، ہم لوگ تیزی سے کالونی پہنچ سکتے ہیں۔''

''پاپا...... آگے نہ جائیے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' ساجد نے عقیل سے گزارش کی۔ عقیل فکر مند ہو گئے۔

کیا کریں اب اس وقت کہاں جائیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سائرن بجتی ایک جیپ وہاں پر آکر رک گئی۔

''آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ معلوم نہیں شہر میں فساد ہو گیا ہے؟'' ایک کرخت آواز نے عقیل کو دہشت زدہ کر دیا۔ مگر آواز کچھ جانی پہچانی تھی......

''تم شمشاد تو نہیں ہو......؟'' ہمت کر کے عقیل نے پوچھ لیا۔ یہ شمشاد ہی تھا۔

''ارے آپ عقیل صاحب! ایسے حالات میں ان بچوں کو لے کر کہاں جا رہے ہیں؟''

''جاؤں گا کہاں...... بس ایک بھائی ہے برے وقت میں بھائی کے علاوہ اور کون ہوتا ہے؟ بڑے اعتماد کے ساتھ عقیل نے کہا۔

''ہاں...... ہاں...... ٹھیک ہے لیکن اس وقت آپ ادھر نہ جائیں۔ فسادیوں نے جگہ جگہ لوٹ مچا رکھی ہے۔ آپ ادھر نہیں جا سکتے خطرہ ہے۔''

’’لیکن......‘‘

’’لیکن ویکن کچھ نہیں آپ میرے ساتھ جیپ میں بیٹھیں۔ میں آپ کو مظفر دادا کے یہاں پہنچا دیتا ہوں۔ وہاں آپ کو دشواری نہ ہوگی آپ جب تک چاہیں رہ سکتے ہیں اور بھی لوگ وہاں ہیں۔‘‘

فساد کی آگ ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ جھٹ پٹ وارداتیں کہیں کہیں رونما ہو جاتیں۔ کرفیو میں بھی ڈھیل ہوگئی تھی۔ سرکاری عملے بار بار اعلان کر رہے تھے کہ شہر پر سکون ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہونے لگے تھے۔ لیکن اس مدت میں یہ شہر ملبے کا ڈھیر ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ جلے ہوئے مکانات، دکانیں، ٹوٹی ہوئی فرنیچرس سڑکوں پر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک محلّہ تو بالکل ہی خاکستر ہو چکا تھا۔ فسادیوں نے پورے گھر کو جلا ڈالا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ تاریخ ساز خطوط اور مشہور و معروف شاعر کے دیوان بھی فرقہ پرستی کی آگ میں جلا دیے تھے۔ وہ خطوط جو غدر کے دور میں بابو کنور سنگھ نے دلی کی آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو تحریر کیے تھے۔ عقیل نے بھی اپنے گھر لوٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس ایک ماہ کی مدت میں مظفر صاحب کے یہاں جو خلوص اور محبت ان کے بچوں کو ملا وہ ناقابل فراموش تھا۔ رخصت ہوتے وقت مظفر صاحب اوران کی اہلیہ و بچوں نے گزارش کی کہ دو چار روز اور ٹھہر جائیں۔ ’’کوئی تکلیف ہوئی ہم لوگوں سے؟ آپ کیوں جانا چاہتے ہیں۔ ماحول بھی کشیدہ ہے۔ ایک دو دن بعد چلے جائیں۔‘‘ مظفر صاحب نے کہا۔

’’نہیں ایسی کوئی بات نہیں‘‘ عقیل نے مظفر صاحب کا ہاتھ تھامتے ہوئے جواب دیا۔ ’’آپ نے تو اپنوں سے بڑھ کر اس برے وقت میں مدد کی ہے۔ ورنہ آج کل......‘‘ عقیل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ مظفر صاحب نے عقیل کو دلاسا دیا اور بھیگی پلکوں سے عقیل نے رخصت لی۔

کچھ دور چلنے کے بعد عقیل نے بیوی سے کہا ’’اجی......! میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے۔ کیوں نہ ہم فی الحال کچھ دنوں کے لیے طفیل کے گھر چلیں اب تو کچھ امن وامان بھی ہے اور وہاں جانا مشکل بھی نہیں۔‘‘ بیوی کی بات سن کر عقیل نے لمبی سانس بھری۔ ’’ھ......ہ...... ..ں لیکن تم تو ان لوگوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو۔ عقیل نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''چھوڑو بھی...... ہمیں مزاج سے کیا لینا دینا۔ اور ویسے بھی اس وقت فساد کی وجہ سے وہ ہمارے لیے پریشان ہوں گے۔ جب ہم پہنچ جائیں گے تو انھیں اطمینان ہو جائے گا۔''

''ہمارے لیے تو پریشان تو نہیں ہوں گے لیکن ہاں خون کا رشتہ تو ہے بھائی ہے وہ میرا۔ چلو...... وہیں چلتے ہیں کم سے کم وہاں کچھ دن رہ کر اس گھر کی مرمت بھی کرا لوں گا۔ فی الحال تو یہ رہنے کے قابل بھی نہیں بچا ہے۔ جیسے ہی عقیل نے حامی بھری بچے اپنی اپنی تکلیفوں کو بھول کر تالیاں بجانے لگے۔ سلیمہ نے کہا'' جانتے ہو ساجد! چاچا کے پاس خوبصورت سی کار ہے ہم لوگ اس میں بیٹھ کر خوب گھومیں گے۔'' ''اور میں روبی کے ساتھ لان میں کھیلوں گی۔ گڑیا نے بھی ساتھ دیا۔ ساجد خوش تھا کہ اسے اپنے چاچا کا نیا اور خوبصورت مکان دیکھنے کو ملے گا۔ سبھی نظموں کو یاد کروں گا۔'' سبھی بچوں نے شور مچایا'' پاپا آپ جلدی چلیں ورنہ شام ہو جائے گی۔ ہمیں شام ہوتے ہی ڈر لگتا ہے۔''

عقیل سوچ میں پڑ گیا پاس میں پیسے بھی کم تھے۔ بچوں کو بھوک بھی لگی ہے با دل نخواستہ اس نے ایک رکشہ لی اور سبھی اس پر سوار ہو کر کلکٹر کالونی کی طرف روانہ ہو گئے۔

گزرتے ہوئے راستوں میں خوبصورت مکانوں کی قطاریں تھیں۔ بچے بڑے شوق سے ہر ایک مکاں پر نگاہیں جمائے چلے جا رہے تھے۔ آخر ایک نہایت خوبصورت کوٹھی نما مکان کے سامنے رکشہ رکی۔ ''دیکھو یہ ہے تمھارے چاچا طفیل کا مکان۔'' عقیل نے بچوں کو انگلی کے اشارے سے بتایا۔

''اف...... کتنا خوبصورت ہے......؟ سلیمہ اور گڑیا یکبارگی بول پڑیں۔ ''میں تو روبی اور عرشی سے جا کر پہلے ملوں گی اور میں زیاد اور رافع سے ساجد اور فرزاد نے بھی سُر میں سُر ملایا۔ سبھی بچے سلیقے سے سڑک پار کر کے گیٹ تک آئے۔ برقی قمقموں کے درمیان جلی حروف میں لکھا تھا ''طفیل کاٹیج'' ابھی عقیل اور ان کی بیوی رکشہ والے کو مزدوری ہی دے رہے تھے۔ اسی درمیان خوشی کے مارے بچوں نے گیٹ کھول دیا اور اندر داخل ہو گئے۔ دونوں طرف مخمل جیسی ہری گھاس کی لان سے سامنے کے راستے سے بچے ہنستے کھیلتے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک کتے بھونکتے

ہوئے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ساجد، گڑیا، سلیمہ اور فرزاد پر جھپٹ پڑے۔ بچے خوف سے چیخنے چلانے لگے۔ بچوں کی چیخ پکار سن کر عقیل اور آسیہ بی تیزی سے اندر داخل ہوئیں تو اپنے بچوں کے پھٹے کپڑے دیکھ کر پریشان ہوئیں ادھر کتوں کی بھونکنے کی آواز سن کر طفیل کے بچے بالکنی پر آ گئے اور ساجد گڑیا سلیمہ فرزاد کی حالت پر ہنسنے لگے۔ عقیل اور آسیہ بی نے بڑی مشکل سے اپنے بچوں کو چھڑایا اس درمیان طفیل اور ان کی بیوی بھی بالکنی پر آ چکی تھیں۔ ''پاپا...... دیکھو...... ان بچوں کو ہمارے ٹامی اور مارشل نے انکا کیا ڈیزائن بنا دیا ہے۔'' طفیل کے بیٹے نے اس سے کہا۔ طفیل نے بغور دیکھا اور حیرت سے کہا: ''ارے یہ تو بھائی صاحب اور ان کے بچے ہیں۔''

''یہ یہاں کیوں آئے ہیں۔'' طفیل کی بیوی ایک دم ہونق ہو گئی۔

''ٹامی! مارش کم ہیر'' طفیل نے اپنے کتوں کو پکارا۔ دوڑا دوڑا نیچے گیا اور انھیں اندر لے آیا۔ ''بھائی صاحب آپ کے علاقے میں خیریت تو رہی؟'' اس نے پوچھا۔

''خبر نہیں''

''کیا مطلب......؟''

''ہم وہاں نہیں تھے۔ مظفر صاحب کے یہاں پناہ مل گئی تھی۔''

''چلو اچھا ہوا۔ ورنہ اس محلے میں تو گنتی کے ہی مسلمان گھر تھے۔'' طفیل نے کہا اور بیگم سے کہا ''ارے بھائی کہاں ہو؟ دیکھو بھائی صاحب کی فیملی آئی ہے۔''

طفیل کی بیگم نے رسمی سلام دعا کی۔ طفیل نے اشارے سے جانے کے لیے کہا۔

''بھائی صاحب! مجھے کئی بار خیال آیا کہ خدا جانے آپ کا کیا حال ہوگا مگر وہ علاقہ ایسا ہے کہ جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔''

''ہاں اسی لیے تو ہم جان بچا کر نکلے۔ تمھارے یہاں آ رہے تھے کہ راستے میں مظفر صاحب فرشتہ بن کر مل گئے اور ایک ماہ تک انھوں نے اپنے گھر رکھا۔ اب بھی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ واقعی میں ان کا احسان کبھی نہیں چکا سکوں گا۔''

چائے آ گئی تھی۔ ان سبھی نے چائے پی۔ عقیل نے محسوس کیا کہ بھابھی کا موڈ ان کے آنے سے کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ طفیل بھی بار بار بیوی کے ماتھے کی شکنیں دیکھ رہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے گھر تو سارا تہس نہس کر کے رکھ دیا ہوگا۔ سب کچھ لوٹ لیا ہوگا بدبختوں نے۔''

''ہاں مجھے تمھارا اندیشہ درست معلوم ہوتا ہے۔ ویسے بھی میرے مکان کے اطراف میں تو غیر مسلم ہی تھے۔'' عقیل نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''کل صبح چل کر دیکھیں گے۔'' طفیل نے کہا تو اس نے محسوس کیا کہ بھائی میں کچھ رشتے کی اہمیت ابھی باقی ہے۔

صبح ناشتے کے بعد طفیل نے کہا ''چلیے بھائی صاحب! دیکھیں کیا حال ہے آپ کے مکان کا؟

''نہیں ہم خود چلے جائیں گے۔ تم مت جاؤ۔ کرفیو کھل گیا ہے مگر حالات تو کشیدہ ہیں نا!''

طفیل کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ بھائی صاحب جہاں دیدہ آدمی ہیں یا تو انھوں نے ہمارے رویوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے یا پھر ہم میاں بیوی کی گفتگو کی بھنک سن لی ہے۔ اور بات یہی تھی۔ پھر بھی اس نے کہا ''میں گاڑی سے پہنچا دیتا۔

''ٹھیک ہے چلو۔''

اور عقیل اپنے بچوں کے ہمراہ اپنے گھر کے لیے رخصت ہو گئے۔ محلے میں داخل ہوئے تو جہاں جہاں اقلیتی فرقے کے مکانات تھے جلے ہوئے اور اجڑے ہوئے تھے۔ کار جیسے ہی عقیل کے دروازے پر رکی تو وہ حیران رہ گیا۔ مکان میں تالا لگا ہوا تھا۔ مگر اب اس پر سنیل کمار ایڈوکیٹ کی تختی لگی تھی۔ عقیل نے کار سے اترتے ہوئے سوچا اس کا مطلب یہ ہے کہ مکان پر قبضہ بھی کر لیا گیا ہے۔ اس نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھولنے کے لیے بڑھا ہی تھا کہ سنیل کمار جی نکل آئے...... وہ عقیل کے بوڑھے پڑوسی تھے۔

''بیٹا تم آ گئے...... ٹھیک تو ہونا!''

''ہاں ٹھیک ہوں...... مگر چاچا یہ کیا ہے۔ میرے مکان پر آپ کے بیٹے کا قبضہ؟

''ہاں...... مجبوری میں ایسا کرنا پڑا۔''

''کیا مطلب؟''

''تم تالا کھولو، اندر چلو۔'' سشیل کمار جی نے کہا'' اور پیار سے بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

تالا کھول کر طفیل، عقیل اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ سشیل چاچا بھی اندر آ گئے۔

''دیکھو بیٹا، کہیں کسی چیز کو نقصان تو نہیں پہنچا ہے۔ انھوں نے دیکھا خلافِ توقع ان کا مکان جوں کا توں محفوظ ہے۔''

''بیٹھو بیٹا۔'' سب بیٹھ گئے۔ انھیں بے انتہا خوشی تھی اور حیرت بھی کہ ایک بڑے طوفان سے اللہ نے نہ صرف ان کی جانیں بلکہ مال بھی محفوظ فرمایا تھا۔

''چاچا یہ سب کیسے ہوا؟'' عقیل نے پوچھا۔

چاچا نے بتایا'' بیٹا! تم تو خوفزدہ ہو کر چپکے سے چلے گئے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا تو ہم جانے ہی نہ دیتے۔

اب چلے ہی گئے تھے تو پھر ہماری ذمہ داری تھی کہ تمھارا مان اور تمھارا مال بچائیں۔ بلوائی کسی کے دوست نہیں ہوتے۔'' کچھ لڑکے بری نیت رکھتے بھی تھے میں نے کہہ دیا کہ چاچا کی زندگی میں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ سو وہ مان گئے۔ اب ڈر تھا تو باہری بلوائیوں کا تھا۔ سو سب نے سنیل سے کہا بیٹا اپنے مکان کی تختی تو اپنے عقیل بھیا کے گھر پر لگا دے جس سے یہ لٹنے سے بچ جائے۔''

''چاچا آپ بڑے مہان ہیں۔''

''نہیں بیٹا...... یہ میرا فرض تھا۔ تمھیں نہیں معلوم تمھارے دادا اور پتا جی کتنے مہان پرش تھے۔ بیٹا! ہم سب انھیں کے بسائے ہوئے ہیں۔ تقسیم کے وقت ہم بھی لٹے پٹے سرحد پار

کر کے آئے تھے۔ انھوں نے ہمیں یہاں رکھا تھا۔ میں نے تو بیٹا ان کے احسان کا ذرا سا بدلہ چکایا ہے۔ بیٹا تم سمجھ نہیں سکے۔ حالات بگڑے تو تم نے بھی ہندو مسلم کی عینک سے دیکھ کر اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ تم نے ہم پر بھروسہ نہ کیا۔ تم میرے سنیل کی طرح میرے بیٹے ہو اور میرا گھر تمھارا گھر ہے۔ میری بہو اور میرا بیٹا تمھاری سیوا کرتے تم نے اس کا اوسر (موقع) نہیں دیا۔

طفیل مبہوت ہو کر سشیل چاچا کی باتیں سن رہا تھا اور اپنے اور اپنی بیوی کے رویے پر اندر ہی اندر ندامت سے پگھل رہا تھا۔ عقیل نے سوالیہ نظروں سے طفیل کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ بھائی کے گلے سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

سائے میں دھوپ

یکا یک ٹرک کا بریک لگا، ایک چیخ کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ سائیکل، رکشہ، تانگہ بھی رک گئے۔

''جی ٹی روڈ پر اس طرح چلنا ہی نہیں چاہیے۔'' بھیڑ میں سے کسی کی آواز آئی۔ ''ارے نہیں صاحب یہ ٹرک والے بہت غلط ڈھنگ سے چلتے ہیں، چھوٹی گاڑیوں کو تو یہ ماچس کے ڈبوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ انھیں کون سمجھائے کہ چھوٹی گاڑیوں میں بھی انسان سفر کرتے ہیں۔'' کسی دوسرے شخص نے ردعمل ظاہر کیا۔ آس پاس کے تمام لوگ اس حادثہ کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے میں بھی بھیڑ کی طرف بڑھا۔ زخمی شخص کو دیکھ کر لوٹنے والے لوگ مختلف قسم کے تبصرے کر رہے تھے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا ''آدمی تو بچ گیا؟'' ''پتہ نہیں......؟'' ایک عام سا جواب میرے کانوں سے ٹکرایا۔ جتنے لوگ، اتنی طرح کی باتیں۔ کوئی کہہ رہا تھا: وہ شخص سائیکل سے جا رہا تھا ٹرک نے پیچھے سے دھکا مار دیا۔ دوسری جانب سے آواز آئی ''بچنا مشکل ہے'' سائیکل کا بریک بائیں جانب سینے میں پیوست ہو گیا ہے۔''

میں تیزی سے بھیڑ کو چیرتا ہوا جائے حادثہ پر پہنچا۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا اور وہ نیم مردہ حالت میں اس طرح پڑا تھا کہ چہرہ گرد و غبار سے اٹا تھا۔ پہچاننا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا اسے پانی دو کسی نے ہسپتال پہنچانے کا مشورہ دیا۔ وقت بھی کیا بدلا ہے......؟ حادثے کا شکار بے حس و حرکت کولتار کی تپتی پٹی پر پڑا ہے اور لوگ ایک دوسرے کو مشورے دے رہے ہیں۔ ''تم لے جاؤ...... تم لے جاؤ۔'' آخر میں نے ہمت کی۔ اس کے قریب پہنچا تو میرے

پیروں سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی، تھوڑی دیر کے لیے مفلوج سا ہو گیا...... یہ......؟؟؟ مجھے اس منظر پر یقین نہ تھا۔ میں سوچنے لگا۔ آخر وہ لمبے جدو جہد کے بعد اپنی منزل کے نزدیک آ ہی گیا......! میں نے رکشہ لیا اور ہسپتال پہنچایا۔ سانس ابھی باقی تھی۔ ایمرجنسی وارڈ میں اسٹریچر پر خاموش، ساکت پڑا ہوا وہ آدمی کل تک کتنا Active تھا۔ ڈاکٹر اسے آپریشن تھیٹر میں لے کر چلے گئے۔ میں باہر بیٹھا ماضی کے اندھیروں اور اجالوں میں راہ تلاش کرنے لگا۔ کچھ پیچھے چھوٹے ہوئے بنتے بگڑتے رشتے پھر سے ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے۔

وہ کتابیں پڑھنے کا بڑا شوقین تھا، دنیا کے عظیم ترین مصنف تخلیقات کو اپنے اندر سما لینے کی خواہش نے اسے کتابوں کا کیڑا بنا دیا تھا۔ لیوٹالسٹائے، میکسم گورکی، چارلس ڈیکنس، الیگزینڈر سولزنیٹس اور نہ جانے کتنے مصنفوں کو پڑھنے کا عادی تھا۔ اپنے دوستوں میں مباحثہ کرنے کا موقع تلاش کرتا۔ شام ابھی ختم ہو رہی تھی ستارے ٹمٹما کر رات کے آنے کا پیغام دے چکے تھے۔ برقی قمقمے سڑک کے دونوں کناروں پر روشنی بکھیر رہے تھے وہ لائبریری نے نکل کر سڑک طے کر رہا تھا میں نے پیچھے سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ مڑ کر اس نے حیرت سے مجھے دیکھا ''کہاں جا رہے ہو'' میں نے پوچھا۔

''جاؤں گا کہاں......! تم تو جانتے ہو کہ جب انسان بیکار ہوتا ہے تو اس کا کوئی عزیز اور رشتہ دار اور دوست نہیں ہوتا'' خود اس کے اپنے مسائل ہی عزیز ہوتے ہیں'' وہ کتابی باتیں کرنے لگا۔

دراصل کتابوں کے زیادہ مطالعہ سے بھی انسان عام لوگوں سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی بات تھی۔ اپنی انفرادیت کے سبب وہ سب سے دور ہو گیا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انفرادیت نہ ہو تو اجتماعیت کا وجود بھی نہ رہے گا۔ ہمیشہ کسی منفرد شخصیت نے ہی سماج کے دھارے کو موڑنے میں کامیابی حاصل کی ہے خواہ وہ علی گڑھ تحریک ہو یا بنگال کا برہمو سماج تحریک۔ اس نے مجھ سے سوال کیا...... یہ سماج ہم انسانوں کو جینے کیوں نہیں دیتا...؟'' اس نے چند مخصوص لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہی ضابطے بنا رکھے ہیں اور ان ہی ضابطوں کا سہارا لے کر لوگ اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالتے اور اپنا دفاع بھی کرتے ہیں اس لیے میں اکیسویں صدی کا

مذاق اڑا رہا ہوں۔ میں خوش نہیں ہوں...... خوش رہنے کی اداکاری کرتا ہوں۔ میں جان گیا ہوں کہ سماج کا ہر فرد ایک منجھا ہوا اداکار ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن یہ وہ کردار ہیں جو رشتوں کی اداکاری کرتے ہیں۔'' اس کے چہرے کا تاثر ایک کہانی، ایک مسئلہ، ایک پوشیدہ حقیقت کا ملا جلا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کی باتیں میرے اندر ہل چل پیدا کر گئیں۔ میں نے بہت کریدا مگر کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ تب میں نے تفریحاً پوچھا: یار کوئی عشق کا چکر تو نہیں......؟ شاید اس لیے فلسفی بنتے جا رہے ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ''ہم جیسے قلاش سے کون عشق کرے گا...؟'' اور قہقہہ لگانے لگا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا ''ہم لوگ سراب میں بھٹک رہے ہیں۔ نتیجہ معلوم ہے......؟ لب پر تشنگی سجائے ہوئے ختم ہو جائیں گے اور ہمارے جسم کا ایک ایک ریشہ مختلف کیمیا میں بدل کر فضا میں تحلیل ہو جائے گا۔'' ''یہ تم کہہ رہے ہو......؟'' ''ہاں میں کہہ رہا ہوں میرے اندر کا آدمی بول رہا ہے۔'' بہت سادہ لیکن گہرائی میں ڈوبا ہوا جواب تھا۔

''تم ہمت کیسے ہار سکتے ہو۔ تم تو پختہ عزم کے انسان ہو۔ Struggle کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔ کامیابی ایک دن تمھارا قدم چومے گی۔ جس کا بریف کیس کسی بھی محکمہ میں بھیجے گئے پوسٹل آرڈر کے Counter Foil اور رجسٹرڈ پوسٹ کی رسید سے بھرا ہے۔ اس کی زبان سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ دیکھنا تم ایک دن منزل ضرور پاؤ گے۔ میں نے اسے ہمت دلائی: میری باتیں سن کر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بغیر جواب دیے چل دیا۔ اب وہ زندگی کے ایسے موڑ پر تھا جہاں ایک کے بجائے دو ہو گیا تھا۔ خود اس کا وجود ایک سے تین حصوں میں بٹ گیا تھا۔ تبدیلی کے باوجود روزگار کا پرابلم اس سے جڑا ہوا تھا۔ زندگی ایک طرف بہار لائی تو نہ جانے کتنے ارمانوں کے آبگینے توڑ آئی تھی۔ تمناؤں کا بڑا محل مسمار ہوا تب ان کے کھنڈر سے ایک بہار کا وجود ہوا وہ بھی ایسی بہار جس پر خزاں اپنا اثر چھوڑ رہی تھی، بے روزگاری ابھی تک ساتھ نبھا رہی تھی۔ جس کے باعث نوخیز کلیاں بھی اس کی طرف حقارت سے دیکھتی تھیں۔ وہ اب اتنا Active نہیں رہ گیا تھا۔ زندگی سے لڑنا ایک مشکل کام ہے مگر وہ اسے آسان بنانے کی خاطر بہت کچھ سہتا رہا۔ سنہرے کل کی امید عجیب دوا ہوتی ہے، ہر آدمی تھوڑی دیر کے لیے چست و درست ہو جاتا ہے لیکن اس کے بہار کی ہر شاخ Nepenthese کا گھڑا بن کر اسے لہولہان کر رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو پیس کر پیتا رہا۔

کراہنے کی آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ دوڑ کر وارڈ میں گیا۔ ''پانی...... ...... پانی۔'' وہ پانی مانگ رہا تھا۔ ایسی حالت میں پانی کی ممانعت ہوتی ہے۔ میں اس کے منھ میں سنگترے کا جوس ٹپکا رہا تھا۔ اس کی نظریں ہسپتال کی چھت میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے پوچھا تمھارے والد کو خبر کر دوں؟ لیکن وہ خاموش رہا...... میرے بار بار پوچھنے پر رندھی ہوئی آواز میں وہ اتنا ہی کہہ سکا: سڑکوں، گلیوں اور کوڑے دان میں پھینکے ہوئے ناجائز بچے کو بھی لوگ ہمدردی سے اٹھا کر سینے سے لگا لیتے ہیں مجھے تو اس لائق بھی نہیں سمجھا گیا۔ ہمدردی بانٹ سکتا ہوں حاصل کرنا میرا مقدر نہیں۔ اس لیے کسی کو بھی پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ میری مشکلیں ہی میری عزیز ہیں۔ میری ہمدرد ہیں ابھی تک ساتھ نبھا رہی ہیں۔ تھوڑا پانی کا قطرہ حلق میں ڈال دو زبان بالکل کانٹا ہو رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں آزاد ہو کر گالوں پر پھسل گئیں۔ کمزوری سے وہ آنکھیں بند کرنے لگا، میں نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ ''اٹھو۔ آنکھیں کھولو...... یہ پانی لو...... پانی کے چند قطرے میں نے روئی کے پھائے سے اس کے حلق میں ٹپکا دیے۔ میں فوراً تمھارے ابو کو بلاتا ہوں اب میں تمھاری ایک بھی نہیں سنوں گا۔ ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس نے مجھے کس کر پکڑ لیا۔ نہیں...... کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ وہ لوگ چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں میرے اندر آفتاب جیسی تمازت کہاں......؟ میں تو بس ڈوبا ہوا تارہ ہوں جو اپنا وجود رکھتے ہوئے بھی آفتاب کی روشنی میں دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے اب نہیں۔ اس کے پلکوں پر ایک بار پھر سیلاب امنڈ آیا تھا جس کی روانی کو روکنے کے لیے بار بار اس کی آنکھیں گردش کر رہی تھیں۔ اس کی سانس اب تیز تیز چل رہی تھی۔ اور میرے قدم جیسے زمین میں دھنسے جا رہے تھے اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی میرا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ کبھی دروازے پر دیکھتا اور کبھی بغل کی ٹنگی Sline کی بوتل کو دیکھتا جس سے قطرہ قطرہ پانی اس کے جسم میں جا رہا تھا۔ یقیناً وہ بڑا حوصلہ مند تھا اب بھی زندگی کے لیے موت سے جنگ کر رہا تھا۔ آنکھیں تیزی سے حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ ''پانی...... پانی...... اس آواز نے مجھے ہمت دی میں ڈاکٹر کو بلانے کمرے سے باہر بھاگا اور فوراً واپس آیا تب تک فیصلہ ہو چکا تھا۔ زندگی موت سے ایک بار پھر شکست کھا گئی تھی۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جس میں دو موتیوں جیسی کوئی چیز ٹھہر گئی تھی۔ ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے کہہ رہا ہو آج منزل مل گئی۔

مگر میرے کانوں میں اب بھی اس کی آواز گونجتی ہے: ''کوڑے دان میں پھینکے ہوئے ناجائز بچوں کو بھی لوگ پیار سے اٹھا کر سینے سے لگا لیتے ہیں مجھے تو اس لائق بھی نہیں سمجھا گیا۔!!''

☆☆☆

سلسلۂ خیر

ریلوے کراسنگ پر گاڑیوں کی لمبی قطار کھڑی تھی۔ دونوں جانب ٹریفک جام تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کافی دیر سے ٹرین نہیں گزری۔ اس درمیان آس پاس گاؤں میں بسے لوگ ایسے موقع پر گاجر، مولی، پپیتے کے سلاد، لیموں پانی، کولڈ ڈرنکس اور ٹھنڈے پانی کی بوتلیں آنے جانے والے مسافروں کو ضروری اشیاء مل جاتیں اور گاؤں کے غریب لوگوں کو روزگار۔ بسوں اور کھڑی کاروں کے چاروں جانب ناریل کے کاش، گاجر مولی کے سلاد، لیموں کے شربت بیچنے والوں کی بھیڑ تھی۔ لوگ اپنی ضرورت کے مطابق سامان خرید کر کھا پی رہے تھے۔ وقت گزارنے کا یہ سب سے اچھا ذریعہ تھا۔ رات کے ٹھیک بارہ بجے لکھنؤ میل دندناتی ہوئی گزری اور فوراً ہی تمام بسوں و کاروں سے دھوئیں کی غراہٹ سنائی پڑنے لگی۔

ریلوے کراسنگ کا بیری کیٹر کھلتے ہی چھوٹی بڑی گاڑیاں گزرنے لگیں۔ سیٹھ جبار کے ڈرائیور نے بھی گاڑی بڑھادی لیکن وہ آگے جارہی بس کو اوورٹیک نہ کرسکا۔ بات یہ تھی کہ بس کے برابر دس بارہ سال کا لڑکا بس میں بیٹھے ایک مسافر سے پیسے مانگ رہا تھا بس دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی اور وہ بار بار مسافر کو مخاطب کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ''بابو جی! پیسے دیجیے بابو جی جلدی کریں مجھے اور بھی سواریوں کو دیکھنا ہے'' بس کی رفتار قدرے بڑھ چکی تھی۔ ''بابو جی! پیسے نہیں تو کم سے کم میرے پانی کی بوتل ہی لوٹا دیں'' لیکن مسافر پر بچے کی پکار کا کوئی اثر نہ ہوا وہ کھڑکی سے منھ نکالے ہنستا رہا لڑکا کافی دور تک بس کے ساتھ بھاگتا گیا آخر کار بس پوری رفتار سے نکل گئی اور وہ بھاگتے بھاگتے رک کر دور جاتی تیز رفتار بس کو دیکھتا رہا جس میں بیٹھے ایک

مسافر نے اس کی محنت کی کمائی کو اغوا کر لیا تھا۔ سیٹھ جبار کی کار پیچھے پیچھے جا رہی تھی اور وہ یہ منظر اپنی کار میں بیٹھے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ شاید اس منظر سے ان کا گہرا تعلق تھا، ان کے ذہن کے اسکرین پر ماضی کے واقعات نمودار ہونے لگے۔

پڑھنے لکھنے کے دور میں اس کے بھی کمسن کاندھوں پر گھر کے خرچ کا بار آ گیا تھا۔ والد کو نشہ کی بری عادت لگ چکی تھی۔ اسکول جانا بھی بند ہو گیا۔ گھر کے باقی افراد چاچا، چاچی اسے گری نگاہ سے دیکھنے لگے۔ امی بہت پریشان رہتیں۔ والد صاحب میں کوئی سدھار نہیں ہو رہا تھا۔ نشہ کرنے کے لیے رفتہ رفتہ والد نے بیشتر جائدادیں بیچ دیں اور ایک دن وہ سب کو روتا چھوڑ کر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اب اس کا پرسانِ حال کوئی نہ تھا۔ خاندان کے تمام افراد نے نظریں موڑ لیں جو کچھ تھوڑی بہت زمین تھی اس پر چاچا نے زبردستی قبضہ کر لیا۔ وہ گھر سے بے گھر ہو گیا۔ دانے دانے کو محتاج۔ اس کی امی لوگوں کے کپڑے سیتیں اور وہ ریلوے اسٹیشن پر کبھی سموسے، کبھی پانی کی بوتلیں فروخت کرتا۔ یہی زندگی کا معمول تھا۔

ایک بار کی بات ہے گرمی کے موسم میں تیز لو کے جھونکے بدن جھلسا رہے تھے جیسے ہی ٹرین رکی وہ بالٹی میں پانی لیے ہر ایک ڈبے کے سامنے پکارتا رہا۔ ''پینے کا ٹھنڈا پانی'' ''پینے کا ٹھنڈا پانی'' گاڑی ابھی رکی بھی نہ تھی کہ وہ پانی کی بالٹی ہاتھوں میں لے کر دوڑنے لگا، یہ بھی ہوش نہ رہتا کہ ذرا سی ٹھوکر لگی تو وہ ٹرین کے نیچے آ سکتا تھا۔ زندگی کو جینے کے لیے موت سے آنکھ تو ملانا ہی پڑتا ہے۔ وہ پانی کی بالٹی لیے ایک ڈبے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شاید آج کسی کو پانی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ پینٹری کار والے بھی آج کل بیسلیری کے چلڈ واٹر سپلائی کرتے ہیں لہٰذا اس غریب کے نل کا پانی کون لے۔ وہ مایوس ہو چکا تھا کہ آج ماں بیٹے کو بھوکے ہی رات گزارنا ہوگی۔ اسی لمحہ ایک معمر شخص بوگی سے پلیٹ فارم پر اترا۔ سنگل ٹریک (لائن) کے سبب گاڑی کو سگنل نہیں ملا تھا کوئی ٹرین سامنے کی جانب سے آنے والی تھی اسی لیے گاڑی کافی دیر تک رکی رہی۔ معمر شخص نے اسے اشارے سے لایا ''بیٹے! تمھارے پاس ٹھنڈا پانی ہے۔''

''نل کا پانی ہے لیکن برف جیسا ٹھنڈا نہیں'' اس نے سچ بتا دیا۔

وہ مسکرائے انھوں نے واٹر کولر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''اسے پورا بھر دو۔'' یہ کہہ کر وہ

جیب سے پیسے نکالنے لگے اس مدت میں ان کا کولر بھر چکا تھا۔ ''کتنے پیسے دوں؟'' انھوں نے پوچھا۔ کولر کے حجم کو دیکھ کر بچے نے دس روپے مانگے لیکن نہ جانے کیوں اس معمر شخص نے اسے پندرہ روپے دیے۔ وہ پانچ روپے واپس کرنے لگا لیکن انھوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا ''اسے رکھ لو یہ تمھاری محنت کا پھل ہے۔'' پھر ایک دوسرا منظر ذہن کے پردے پر ابھرا۔

سگنل ہو چکا تھا۔ چند ہی لمحے میں گاڑی چھوٹنے والی تھی۔ تمام مسافر اپنی اپنی بوگی میں جا چکے تھے۔ اتنے میں ایک مسافر نے اس سے پانی مانگا۔ اس نے بوتل پانی سے بھر دی اور واپس لوٹا دیا۔ اس سے پہلے کہ مسافر پیسے دیتا ٹرین کھل چکی تھی۔ اس نے مسافر سے پیسے مانگے لیکن شاید اس مسافر کی نیت خراب ہو چکی تھی وہ تیزی سے دوڑتا جا رہا تھا۔ ''بابو جی میرے پیسے تو دیدو'' بابو جی! پیسے...... بابو جی...... وہ بوگی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ بوگی اب پلیٹ فارم کے آخری حصے تک آ چکی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ ٹرین کی زد میں آ جاتا کسی نے اسے ایک جھٹکے کے ساتھ بوگی کے اندر کھینچ لیا پانی کی بالٹی ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ فارم پر دور لڑھکتی ہوئی نگاہوں سے دور ہو گئی۔ معمر شخص نے اسے ٹرین کے نیچے آنے سے بچا لیا تھا۔

''شرم نہیں آتی ایک معصوم بچے کے ساتھ ظالمانہ مذاق کرتے ہوئے، یہ عمر بچہ کے پڑھنے اور کھیلنے کی ہے پتا نہیں کس مجبوری میں یہ کام کر رہا ہے ابھی یہ ٹرین کے نیچے آ جاتا تو......؟'' انھوں نے مسافر کو ڈانٹ پلائی ساتھ ہی پیسے دلوائے۔ باقی مسافروں نے بھی لعنت ملامت کی۔ معمر شخص نے اس سے چند سوالات کیے۔

انھیں کوئی اولاد نہ تھی۔ اپنی والدہ سے اجازت لے کر ان کے پاس رہنے لگا۔ انھوں نے اسے پڑھایا لکھایا۔ اور اپنے کاروبار کے تمام گر سکھائے۔ اب وہ لڑکپن کے دور سے نکل کر جوانی کی دہلیز پر آ کھڑا ہوا تھا۔ والدہ بھی اب اس کے پاس آ گئیں۔ سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب نے اپنی تمام جائداد کاروبار اس کے نام کر دیے انھوں نے ایک دن اسے اپنے کمرے میں بلایا اور تمام کاغذات حوالے کر دیے اور ہدایت کی ''بیٹے! میرا اس دنیا میں تمھارے سوا کوئی نہیں اللہ نے ساری نعمتیں دیں لیکن ''ابا'' کہہ کر پکارنے والی آواز سے محروم رہا شاید اس نے تمھیں میری قسمت میں لکھ دیا تھا۔ بیٹے! میں اب چراغ سحری ہوں میرے بعد یہ سارا کاروبار تمھیں ہی دیکھنا

ہے لیکن یاد رکھنا میری وصیت ہے کہ جب بھی کوئی بے بس یا مجبور مل جائے اس کی مدد سے ہاتھ نہ روکنا، ہر ایک کے کام آنا۔ پھر چند ہی دن بعد ان کا شفیق سایہ سر سے اٹھ گیا۔

سیٹھ جبار کے منھ سے بے اختیار نکل گیا۔ ابا جان...... ابا جان۔

بچے کو بچانے کے لیے اچانک ڈرائیور نے تیزی سے سائڈ لی۔ سیٹھ جبار، چونک پڑے۔ ''ڈرائیور گاڑی روکو۔''

انھوں نے حکم دیا۔ کار کی کھڑکی سے منھ نکال کر اس بچے کو پاس بلایا۔ ''بیٹے پانی کی بوتلیں ہیں؟''

''جی...... بابو جی کتنی دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''چھ بوتلیں دے دو۔''

''بابو جی چار بوتلیں ہیں۔''

''دیدو...... اور سنو! کیا تم پڑھتے بھی ہو؟''

''جی بابو جی! دن کے اسکول میں پڑھتا ہوں اور رات میں گزارے کے لیے'' ابھی وہ کچھ اور کہتا کہ سیٹھ جبار نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے دیتے ہوئے کہا'' یہ میرا پتہ ہے تم اپنی والدہ سے مشورہ کر کے کل ہی میری فیکٹری کے دفتر میں ملو۔ میں تمھارا انتظار کروں گا۔ اتنا کہتے ہوئے سیٹھ جبار نے کار اسٹارٹ کرنے کا حکم دیا۔ وہ بچہ دور جاتی ہوئی کار کو دیکھتا رہا شاید وہ کار نہیں اس کی تقدیر تھی جو اسے روشن مستقبل کی جانب کھینچ رہی تھی۔ ویزٹنگ کارڈ کے ایک ایک حروف کو غور سے پڑھتے ہوئے وہ اپنے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا اور کارڈ مٹھی میں یوں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا جیسے اس نے تقدیر مٹھی میں کر لی ہو۔

☆☆☆